عالم اسلام کے عظیم مجاہد
امام شاملؒ
ڈاکٹر محمد حامد
نشریات

عالم اسلام کے عظیم مجاہد

# امام شاملؒ

ڈاکٹر محمد حامد

نشریات
۴۰ اُردو بازار، لاہور۔ فون: ۰۳۲۱-۴۵۸۹۴۱۹

۹۲۲٫۹۷۰۹۲ محمد حامد، ڈاکٹر
م ح م۔ا امام شاملؒ، عالم اسلام کے عظیم مجاہد
لاہور: نشریات
۲۰۰۸ء ص ۱۹۲
ا۔سوانح، تاریخ، حربیات
ISBN 978-969-8983-23-9





نام کتاب : عالم اسلام کے عظیم مجاہد۔امام شاملؒ
تالیف : ڈاکٹر محمد حامد
اہتمام : نشریات، لاہور
مطبع : میٹرو پرنٹرز، لاہور
قیمت : ۱۰۰ روپے

ڈسٹری بیوٹرز

فضلی بک سپر مارکیٹ
اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 2212991-2629724

فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اُردو بازار، لاہور فون: 7320318 فیکس: 7239884
ای میل: hikmat100@hotmail.com

# ترتیب



**باب اوّل**

## پس منظر



**باب دوم**

## تحریکِ جہاد کا آغاز

**باب پنجم**

۱۸۳۹ ـــ ۱۸۴۲ء



**باب ششم**

امام شاملؒ کی کامیاب مُہمات



**باب ھفتم**

دارگو کی ناکام مہم

**باب ھشتم**

## حاجی مراد رحمہ اللہ

**باب نہم**

## آخری معرکہ

# حرفِ اوّل

اسلامی تصور کی ممتاز اور نمایاں خصوصیت اجتہاد اور جہاد ہیں۔ اس اجتہادی بصیرت اور جہادی قوت نے امت مسلمہ کو عزت و افتخار عطا کیا۔ اسلامی تصور کی ان دونوں خصوصیات کا اظہار عہدِ رسالت، خلافتِ راشدہ اور مابعد کی اسلامی سلطنتوں میں جاری و ساری دکھائی دیتا ہے۔ جب امت مسلمہ نے اس تصور سے تغافل کا رویہ اختیار کیا تو وہ اپنے افتخار سے محروم ہو کر پستی اور پسماندگی کا شکار ہوگئی۔ بالآخر یہی وہ دو قوتیں تھیں، جن کے ذریعے انھوں نے سیاسی غلامی کے جوئے کو اتار پھینکا اور ایک مرتبہ پھر عزت و افتخار کی زندگی کا راستہ تلاش کر لیا۔ دنیا کے نقشے پر بعض مقامات ابھی تک ایسے ہیں جہاں مسلمان مظلومیت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ استعماری طاقتیں ان پر حملہ آور ہیں اور انھیں آزادانہ جمہوری حقوق سے محروم کیے ہوئے ہیں۔ بیسویں صدی کے اختتام اور اکیسویں صدی کے آغاز پر بھی فلسطین، کشمیر، چیچنیا، اریٹریا، بوسنیا، صومالیہ، افغانستان، عراق اور بہت سے دوسرے حصوں میں امت مسلمہ اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہی ہے۔ ایسی جہادی سرگرمیوں کا ایک مرکز روس اور اس کی مسلم ریاستیں بھی رہیں، جہاں گزشتہ چار صدیوں سے مسلمان اپنے عقیدے اور ثقافت کے تحفظ کے لیے مسلسل جہادی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ پیش نظر کتاب ''امام شامل رحمہ اللہ'' داغستان اور چیچنیا کے ایک ایسے بطل حریت اور مجاہد کبیر کی داستانِ حیات ہے جس کا ہر ورق جہاد کی روح سے سرشار اور جس کی ہر سطر جذبۂ جہاد کی درخشانی سے عبارت ہے۔

کوہِ قاف کا تذکرہ ہماری داستانوں اور تاریخی کہانیوں کا دلچسپ عنوان رہا ہے۔ امام شامل رحمہ اللہ اسی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔ جغرافیائی لحاظ سے قفقاز کے پہاڑوں کے درمیان یہ علاقہ ارال سے شروع ہو کر بحیرۂ اسود تک پھیلا ہوا ہے۔ یہی وہ علاقے ہیں جو داغستان اور چیچنیا کے ناموں سے مشہور ہیں۔ اسلام کی شعاعیں یہاں حضرت عثمان بن

عفان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں پڑیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کے کمانڈر حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے آذربائیجان تک کے علاقوں کو فتح کرلیا۔ اسی دور میں اسلام اس سرزمین میں داخل ہوا اور پھر بعد کی صدیوں میں تبلیغی اور دعوتی سلسلے یہاں پر جاری رہے۔ مؤرخین نے یہ معلومات بھی فراہم کی ہیں کہ ۶۵۱ھ میں عرب گھڑسواروں کا پہلا دستہ داغستان کے جنوب میں دربند کے مقام پر داخل ہوا۔ ان کے امیر کا نام سلیمان تھا۔ ایسے ہی مبلغین کی دعوتی کاوشوں سے اڑھائی تین سو سال میں وادیٔ قفقاز کی اکثریت مسلمان ہوگئی۔

تاتاری حکمران چنگیز خان نے جس عظیم سلطنت کو اپنی قوتِ بازو سے قائم کیا، اس کے خاندان نے اس کی وسعت اور استحکام میں بہت نمایاں اقدام اٹھائے۔ چنگیز خان کے نواسے باتو خان نے ۱۲۳۷ء میں ارال اور بحیرۂ اسود کے درمیانی علاقوں پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ تاریخ میں اس سلطنت کو Golden Horde کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کا دارالخلافہ ''سرائے'' کے نام سے مشہور تھا۔ باتو خان کے بھائی بیرکی خان کو جب اس مملکت کا اقتدار ملا تو اس نے ۱۲۶۱ء میں اسلام قبول کرلیا۔ ازبک خان (۱۳۱۳۔۱۳۴۲ء) نے اپنے دورِ حکومت میں اسلام کو اپنی ریاست کا سرکاری مذہب قرار دیا۔ یوں اس علاقے کی اکثریت نے اسلام قبول کرلیا۔ ۱۴۸۰ء میں تاتاریوں کی یہ سلطنت بکھر گئی اور پھر اس علاقے میں روسیوں نے قبضہ کرلیا جس کے نتیجے میں آرتھوڈوکس عیسائیوں کو اپنی تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ گذشتہ پانچ صدیوں سے مسلم اکثریت کے اس علاقے کو بتدریج ایک اقلیت میں تبدیل کرنے کی سازشیں جاری ہیں۔ ۱۵۲۵ء میں زارانِ روس کی حکومت وجود میں آئی تو اس نے بزورِ شمشیر ان علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی کوشش کی۔

زارانِ روس اپنی فوج کی کثرت اور دولت کی فراوانی کے باعث اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے عزائم رکھتے تھے۔ اسی غرض سے ۱۵۴۷ء میں انھوں نے قفقاز پر پہلا حملہ کیا۔ اس کے بعد ان کی فوجی یورشیں اور عسکری حملے جاری رہے مگر انھیں کبھی نمایاں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ انیسویں صدی کے آغاز میں روسی زاروں کی ہوس گیری اور بھی بڑھ گئی مگر قفقاز میں مسلم مجاہدین کی سرگرمیاں بھی زور پکڑ گئیں۔ جہادی لوگوں کی زمامِ کار علماء اور صوفیاء کے ہاتھ میں

آ گئی۔ قفقاز کے مشہور عالم محمد یارا کی نے ۱۸۲۳ء میں احیائے اسلام کے لیے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ ان کے شاگرد علم دین کی تحصیل کے ساتھ تزکیہ نفس کے مراحل بھی طے کر رہے تھے۔ نقشبندی طریقت کی یہ تحریک اس علاقے میں مریدیت کے نام سے معروف ہوئی۔ اس تحریک کے عمائدین نے ایک طرف روسی مظالم کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی اور دوسری طرف داغستان اور چیچنیا میں نفاذِ شریعت کو اپنا ہدف بنا لیا۔ ان دونوں اہداف کے حصول میں تحریک مریدیت نے نمایاں کردار انجام دیا۔

جنوری ۱۸۳۰ء میں گیمرے کی مسجد میں مجاہدین نے علم جہاد بلند کرنے کا عزم کیا۔ ان میں سے قاضی محمد (پ ۱۷۹۳ء) معروف عالم دین محمد یارا کی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنے تمام شاگردوں میں علوم شرعیہ کی تعلیم کے ساتھ جہادی روح بھی بیدار کی۔ قاضی محمد ایک شعلہ بیان مقرر تھے۔ رسوم و بدعات کے خلاف سخت وعظ کہتے اور لوگوں کی اصلاح کرتے تھے۔ یہ سب لوگ امام شیخ منصور رحمہ اللہ (پ ۱۷۶۰ء) کی برپا کردہ تحریک جہاد سے بھی متاثر تھے۔ شیخ منصور جنھوں نے حفظ قرآن کی سعادت کے علاوہ کئی ملکوں اور علاقوں سے دین و شریعت کی تعلیم حاصل کی، چوبیس برس کی عمر میں عملاً جہاد شروع کیا۔ ترکی کی سلطنت عثمانیہ بھی ان کے لیے مالی اور عسکری معاونت فراہم کرتی تھی۔ ان کی جہادی سرگرمیوں میں تیس ہزار کے قریب روسی فوجی مارے گئے مگر بالآخر وہ گرفتار ہو گئے۔ انھیں قید میں ڈال دیا گیا، جہاں وہ تپ دق کے مرض کا شکار ہوئے اور ۱۳۔ اپریل ۱۷۹۴ء کو راہیٔ ملکِ عدم ہوئے۔ شیخ منصور خود تو اپنے مالک کے حضور پہنچ گئے مگر ان کی برپا کردہ جہادی تحریک شعلۂ جوالہ بن چکی تھی۔ بہت سے دوسرے علماء اور جہادی اکابر کی طرح امام شامل رحمہ اللہ بھی انھیں اپنا استاد سمجھتے تھے۔

مشہور قفقازی امام اور مرشد محمد یارا کی نے تین اہم ترین شاگرد اور مرید پیدا کیے جو امام جہاد کے مرتبے پر فائز ہوئے۔ ان میں سے پہلے امام قاضی محمد تھے۔ یہ ایک جہادی روح اور انقلابی مزاج رکھتے تھے۔ امام شامل رحمہ اللہ ان کے بچپن کے دوست تھے۔ یہ امام شامل سے صرف چار سال بڑے تھے۔ قاضی محمد نے اصلاحِ معاشرت سے اپنی دعوت کا آغاز کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں لوگ ان کے پرچم تلے جمع ہو گئے۔ جنوری ۱۸۳۰ء میں جب انھوں

نے جہاد کا باقاعدہ اعلان کیا تو صف اول میں ہمزاد بیگ (گمزاد بیگ) اور امام شامل، ان کے ساتھ کھڑے تھے۔ قاضی محمد کو روسیوں کے نیزوں پر شہادت کا رتبہ حاصل ہوا، ان کا بھتیجا محمد سلطان بھی اس معرکے میں شہید ہو گیا مگر امام شامل اس معرکے میں زخمی ہونے کے باوجود معجزانہ طور پر بچ گئے اور ایسے معجزانہ عجائب ان کی جہادی زندگی میں کثرت سے ملتے ہیں۔ ہمزاد بیگ بھی ۱۸۳۴ء میں ایک مسجد میں شہید کر دیے گئے۔

امام شامل رحمہ اللہ (۱۷۹۹-۱۸۷۱ء) اس تحریک جہاد کے تیسرے امام منتخب ہوئے۔ روسی استعمار کے خلاف جدوجہد میں امام شامل رحمہ اللہ کا کردار تاریخ ساز اور مثالی ہے۔ ان کی پیدائش دین کاؤ مگاما کے گھر داغستان میں ہوئی۔ مختلف اسلامی علوم کی تحصیل کی۔ عربی زبان میں انھیں کمال کی مہارت حاصل تھی۔ ان کا جسم بہت ورزشی تھا۔ پہلوانی، نشانہ بازی، شمشیر زنی اور گھڑ سواری میں وہ طاق تھے، جس کے باعث وہ بارہا آزمائشوں اور حملوں میں بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ وہ بلا کے مقرر تھے جن کی شعلہ بیانی سے دل دہل جاتے تھے۔ انھوں نے عملاً ایک اسلامی حکومت قائم کر دی جس کی بنیادیں جمہوری اور شورائی تھیں۔ ان کے تین نائبین تھے جبکہ شورائے بالا چھ ارکان پر مشتمل تھی۔ ان کی فوج کا بھی اس طرح مستقل نظام تھا۔ انھیں بہت کم وقت میں مؤثر مجاہدین کو جمع کرنے کا فن آتا تھا۔ اپنی ریاست میں انھوں نے دفاع، تعلیم، انصاف، خزانہ، بہبود اور مذہبی و اقلیتی امور کی وزارتیں قائم کر رکھی تھیں۔ فوجی نقطۂ نظر سے حساس اداروں اور خفیہ پولیس کا نظام بھی قائم تھا۔ شرعی عدالتوں اور محاسبے کے نظام نے داخلی وحدت کو قائم کرنے میں بہت مدد دے رکھی تھی۔ پوری ریاست میں کل بیس ہزار مجاہدین بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے پاس دس ہزار کے قریب گھوڑے تھے۔ ان کے نائبین کے پاس تین صد گھڑ سوار ہوتے تھے جو مزید دس اور سو مجاہدوں کی صورت میں موجود رہتے تھے۔ طریق جنگ میں کھلی جنگ کے بجائے گوریلا وارفیئر کے سب طریقے آزمائے جاتے تھے۔ گوریلا طرزِ جنگ کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جس سے وہ باخبر نہ ہوں۔ اسی باعث ۱۸۵۹ء تک انھوں نے روسیوں کے ہزاروں سپاہیوں کو ہلاک کر کے ان میں دہشت اور ہیبت پیدا کر رکھی تھی۔ دشمن کے قیدیوں سے حسن سلوک کی بنا پر بہت سے قیدی مسلمان بھی ہو گئے۔

امام شامل کی مجلس شوریٰ نے ان کی حفاظت کے لیے ایک خصوصی حفاظتی دستہ بنا رکھا تھا جس کا نام مورتی زیگا تارے تھا۔ آپ اس حفاظتی دستے کے درمیان اس طرح سے چلتے تھے کہ یہ کلمۂ طیبہ کا ورد کر رہا ہوتا تھا۔ اس اجتماعی ورد سے ایک عجیب روحانی کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ امام کی مجاہدانہ اور انقلابی تفصیلات سے پیش نظر کتاب آراستہ ہے۔ روس کی آمرانہ اور جابرانہ حکومت نے اپنے وسائل کو امام شامل کے جہاد کو ختم کرنے میں لگا رکھا تھا۔ فوج کی کثرت اور وسائل کی قوت کے باوجود مجاہدین نے نصف صدی تک انھیں ناکوں چنے چبوا دیے مگر بالآخر امام ۲۵، اگست ۱۸۵۹ء کو گرفتار ہوئے۔ ماسکو کے قریب ''کالوگا'' نامی گاؤں میں انھیں نظر بند کیا گیا۔ دس برس کی نظر بندی کے بعد زارِ روس نے انھیں مکہ معظّمہ جانے کی اجازت دی۔ ۴ فروری ۱۸۷۱ء کو عالم اسلام کا پہلا گوریلا لیڈر اپنے نبی مکرم ﷺ کے شہر مدینہ منورہ میں ملک عدم کو سدھارا۔

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس دور میں جن عظیم مقاصد کے لیے امام شامل رحمہ اللہ قفقاز کے پہاڑوں میں سرفروشی دکھا رہے تھے، برصغیر میں تحریک مجاہدین کے سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید بھی انھی اہداف کے لیے راہِ شہادت پر گامزن تھے۔

''امام شامل رحمہ اللہ'' عالم اسلام کے اس عظیم مجاہد کی داستانِ تگ و تاز ہے جس نے جہاد کے سرفروشانہ عمل کے ذریعے ایک اسلامی ریاست کے قیام اور اس میں نفاذ شریعت کے لیے روسی جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اس سوانح کے فاضل مؤلف ڈاکٹر محمد حامد علمی دنیا کے ایک معروف مصنف ہیں۔ وہ انگریزی ادبیات کے استاد رہے ہیں۔ راہِ تصوف کے سالک ہونے کی حیثیت سے عربی اور فارسی متون سے ان کی شناسائی لائق رشک ہے۔ ڈاکٹر حامد وسیع المطالعہ اور کثیر التصانیف ہیں۔ انھوں نے ابھی تک ساٹھ کے قریب کتابیں لکھی ہیں جن میں سے بہت سی غیر مطبوع ہیں۔ طبع شدہ کتابوں میں عثمان دقنہ، افکار اقبال، سائبیریا سے افغانستان، بھارت اسرائیل گٹھ جوڑ، تحریک مجاہدین سے تحریک پاکستان تک، اور قصیدۂ بردہ

شریف کے پانچ تراجم زیادہ اہم ہیں۔ان سارے علمی اور عملی عوامل نے پیش نظر کتاب کو ایک شاہکار بنا دیا ہے۔ان کا اسلوب علمی اور تحقیقی ہے۔مگر وہ بین السطور میں اسلامی تہذیب کے اوضاع و اطوار کی درخشانی کے تمنائی ہیں۔اس کتاب کے بہت سی زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں اور ہوں گے۔ میرے نزدیک یہ ایک ایسی علمی کاوش ہے جس نے ماضی قریب میں مسلمانوں کے خطوں میں جہادی سرفروشی کے جذبات کو بیدار کیا ہے۔اہل علم اس راز کو جانتے ہیں کہ جہاد تو اعلائے کلمۃ الحق، مستضعفین فی الارض سے تعاون اور استیصال فتنہ کے لیے برپا ہوتا ہے۔اسی باعث جہاد عالمی امن کی ایک ضمانت ہے۔عالم اسلام کی اٹھاون ریاستیں اسی جذبۂ جہاد کی سرفروشی کے نتیجے میں معرض وجود میں آئیں اور ان کا استحکام بھی اسی جذبے کے ساتھ وابستہ ہے۔اسلامی ریاستوں کے قیام کے بعد اب اجتماعی اجتہاد کے ذریعے اس روحِ اسلام کو بروئے کار لا سکتے ہیں جو دین و شریعت کا حقیقی مقصود ہے۔ فاضل مصنف کی یہ علمی کاوش لائق تحسین ہے۔اس کتاب کی اولین اشاعت ۱۹۷۴ء میں ہوئی۔اس کے بعد جہادی صورتحال نے دنیا کے نقشے پر بہت سی تبدیلیاں پیدا کی ہیں اور ان میں سے سب سے بڑی تبدیلی ۱۹۹۱ء میں خود روس کے انہدام کی صورت میں رونما ہوئی ہے۔ان سب تبدیلیوں کے تاریخی تناظر کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔نشاۃِ اسلامی کی موجودہ صدی میں اس کتاب کے مطالعہ کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ عالمی احیائے اسلام کے خواب دیکھنے والے حضرات اور تحریکوں کے کارکنوں کے لیے یہ تحریر ایک سوغات کا درجہ رکھتی ہے۔اللہ تعالیٰ اس تصنیف کو مصنف کے حسنات میں اضافے کا موجب اور عامۃ المسلمین کے دل و دماغ میں جذبۂ جہاد بیدار کرنے کا ذریعہ بنائے۔

آمین یارب العالمین

پروفیسر عبدالجبار شاکر
ڈائریکٹر بیت الحکمت لاہور

۱۴راگست ۲۰۰۷ء

# پیش لفظ

جب فرنگ کے استعمار کا طوفان اُٹھا تو اس نے سارے عالم اسلام کو مضمحل اور ناتواں بنا دیا۔ بعض ممالک تو اپنے استقلال اور وجود ہی سے محروم کر دیے گئے اور جو آزاد بچے ان پر بھی بالواسطہ مغربی تسلّط ایسا قائم ہُوا کہ ان کی دسترس میں ان کے داخلی معاملات بھی پُوری طرح نہیں رہے۔ اسلامی دُنیا کی اس شِکست کے بہت سے اسباب ہیں جن پر یہاں بحث کا موقع نہیں ہے۔ البتہ اس بات کا ذکر برمحل ہے کہ مُسلمانوں کی آزادی کی خاکستر میں بعض چنگاریاں بھی بچی رہیں جنھوں نے فرنگی سیلاب کا اپنے مقدُور سے زیادہ مقابلہ کیا۔ حشر تو وہی ہُوا جو سیلاب کے مقابلے میں چنگاری کا ہوتا ہے، البتہ انھوں نے تھوڑی دیر کے لیے جو شُعلہ بھڑکایا اس کی تنویر سے ابھی تک ہمارے دل و دماغ کے چراغ روشن ہوتے ہیں۔ اگر یہ چنگاریاں اپنی قدرت سے زیادہ مقاومت نہ کرتیں تو شاید مسلمانوں کے دلوں میں شمع آزادی کی لو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بُجھ جاتی۔ اللہ تعالیٰ ان تمام مجاہدین کی لحدوں کو نور سے بھر دے جن کے قلب کی حرارت نے مسلمانوں کے سینے کے سوز کے لیے برقی قوت کے خزانے کا کام انجام دیا۔

یہ المیہ کہ مُسلمانوں کی آزادی اور قوّت کے تمام قلعے مسمار ہو گئے، ان کی خواہش زیست کو ختم کرنے کے لیے کافی ہوتا اگر یہ مجاہد یہ تسلیم کرنے سے انکار نہ کر دیتے کہ مسلمانوں کا مقسوم غُلامی ہوسکتی ہے۔ انھیں یقین واثق تھا کہ مسلمان غلامی کی زندگی بسر کرنے کے لیے پیدا نہیں ہُوا، اس لیے مظلومیت کی شب تار کے اُفق پر کہیں تو سپیدۂ سحر کی نمود ہو گی۔ اور اگر اس وقت نہیں ہے تو کبھی تو وہ نمُودار ہو کر ظلمت پر کامیاب یلغار کرے گی۔ انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ نمودِ سحر ان کی کوششوں سے ہوگی یا نہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے بہتے ہوئے خُون اور بہتے

ہُوئے زخموں کی سُرخی سے کسی شفقِ سحر کی تعمیر ہو گی یا نہیں۔ ان کے نزدیک اس وسوسے کی بھی کوئی اہمیت نہ تھی کہ کسی سیلِ رواں کو عارضی بند بنا کر نہیں روکا جا سکتا۔ شاید وہ یہ جانتے تھے ؎

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اور اسی وجہ سے انھیں جہاد کرنے میں ادنیٰ تامُّل بھی نہیں ہُوا۔

خود ہمارے برِّعظیم میں ایسے مجاہدوں کے کارناموں سے تاریخ کے اوراق مُزیّن ہیں۔ ٹیپو سُلطانؒ نے شہادت کو ماتحتی پر ترجیح دی۔ سیّد احمد شہیدؒ اور ان کے رُفقا کے کارناموں سے ہندو پاکستان کی تاریخ کا کون سا سنجیدہ طالب علم واقف نہیں ہے۔ ۱۸۵۷ء کی داستان خونچکاں آج بھی ہمارے ادب میں کبھی کبھی گُلکاریاں کرتی ہے۔ مولانا احمد اللہؒ، عظیم اللہ خانؒ، خان بہادر خانؒ اور بہت سے ناموروں کے ناموں کو عوام بھول گئے ہیں لیکن ایسا کوئی شخص نہیں ہے جو 'غدر' کے التہابِ عظیم سے بالکل ناواقف ہو۔

خود میری زندگی میں طرابلس میں اطالویوں کے مظالم کے خلاف سنوسیوں کے جہاد کے واقعات کی اطّلاعات ہندوستان کے اخباروں اور رسالوں میں چھپتی رہتی تھیں۔ ان پر اطالوی جس سنگدلی سے تشدّد کرتے تھے' اس کا ذکر سُن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ ان کے شیوخ کو ہوائی جہاز پر اُوپر لے جا کر زمین پر پٹخا گیا۔ ان کے وسیع ریگستان میں جو معدُودے چند نخلستان تھے' ان کے چشموں اور کنوؤں میں کنکریٹ بھر دی گئی۔ ساحلی علاقوں کو خالی کرا کے اطالوی آباد کیے گئے اور اگر کوئی عرب اس علاقے میں داخل ہونے کی جرأت کرتا تو اُسے گولی سے مار دیا جاتا لیکن پھر بھی جہاد جاری رہا اور آخر کار لیبیا کی آزاد مملکت کی بُنیادیں ان کے خون اور ہڈیوں سے مضبوط ہوئیں۔ مراکش کے کوہستانی علاقہ ریف میں غازی عبدالکریم نے ہسپانوی استعمار کو کچھ دن کے لیے ہلا دیا۔ اتاتُرک نے اسلام نہ سہی' وطنیت ہی کے نام پر شکست خوردہ اور جنگ سے تھکے ہوئے تُرکوں کو یونانیوں اور ان کی مربّی دُوَلِ مُتحدّہ سے ٹکرا کر کامیابی حاصل کی۔ اور آج بھی فلسطین کے فدائی' ہر چند بر خود غلط اور نقصان رساں طریقوں سے سہی' لیکن بہر حال مصروفِ پیکار ہیں۔

یہ تمام واقعات اس امر کی نشان دہی کرتے ہیں کہ مسلم اقوام میں مسلسل جذبۂ جہاد زندہ رہا ہے اور وہ اب بھی سرد نہیں پڑا ہے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی امام شاملؒ کا جہاد ہے۔ ان کی شخصیت اور ان کے کارناموں سے اسلامی دنیا زیادہ واقف نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے علاقوں کی تاریخ اور کیفیت کے متعلق ہمارے خطۂ زمین میں علم کا فقدان ہے اور امام شاملؒ کے سلسلے میں تو معلومات کی ایسی کمی ہے کہ بہت سے لوگوں نے تو ان کا نام بھی نہیں سُنا۔ اس کمی کو اس کتاب کے مُصنّف جناب محمد حامد صاحب نے بوجوہ احسن پُورا کیا ہے۔

روسیوں نے مسلمانوں کی وسیع و عریض مملکتوں پر قبضہ کر لیا اور وہ اب بھی جاری ہے۔ ان علاقوں سے ہمارا ثقافتی اور دینی رشتہ بہت گہرا رہا ہے۔ ہم پاکستانیوں کی ثقافت پر تو وسطِ ایشیا کی ثقافت کا اتنا گہرا اثر ہے کہ دونوں ثقافتیں آج تک حد درجہ مُماثل ہیں البتہ قفقاز اور اس کے ہم جوار علاقوں سے ہمارا اتنا گہرا تعلّق نہیں رہا۔ تاہم وہ بھی انھی دینی اور ثقافتی روایات کے حامل ہیں، جنھوں نے ہمارے ملّی جذبے کی پرورش کی ہے۔ ان تمام روابط کے باوجُود آج ہم ان کے حالات و تاریخ سے بے خبر ہیں۔ پہلے تو ایشیا میں دو عظیم فرنگی سامراجیوں یعنی سلطنتِ برطانیہ اور تسلُّط رُوس نے ہمیں ان سے ایسا جُدا کیا کہ ایک کو دُوسرے کی خبر نہیں رہی اور اب وسطِ ایشیا اور قفقازی علاقوں کے مسلمان رُوسی حکومت کے آہنی پردے کے حصار میں بند ہیں اور ہمارے تعلُّقات کو نہایت اہتمام کے ساتھ ختم کیا گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہمیں ان مساعی کا علم نہیں ہے جو ان علاقوں کے مُسلمانوں نے پہلے زارِ رُوس کی جارحیت کے خلاف جاری رکھیں اور نہ ہم اس کش مکش سے واقف ہیں جو مُسلمان ابتداء اشتراکی رُوس کی ہوسِ مُلک گیری کے خلاف کرتے رہے اور بعد اپنے دین کو بچانے کے لیے مجبوری و محکومی کے زمانے میں اب تک کر رہے ہیں۔

اسی مُسلسل جدّ و جہد کی اک کڑی داغستان کے علاقے میں زارِ رُوس کی حکومت کے خلاف امام شاملؒ کا جہاد ہے جس نے رُوسی افواج کے دانت کھٹے کر دیے تھے۔ لیکن جسے بالآخر ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ اس لیے کہ ایک طرف تو چند بے وسیلہ جانباز مجاہد تھے اور دُوسری طرف

ایک زبردست منظّم قوّت کے بے پناہ وسائل۔ مگران وجوہات کے باعث جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں، اسلامی دنیا کے اکثر دانشور امام شاملؒ کے کارنامے تو درکنار ان کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں۔ محمد حامد صاحب نے اُردو داں طبقے کو اس عظیم مجاہد سے متعارف کرا کے ایک مستحسن خدمت انجام دی ہے اور ان کے متعلّق معلومات کو جُستجو اور کاوش سے جمع کیا ہے۔ مجھے اُمّید ہے کہ یہ کتاب دلچسپی سے پڑھی جائے گی اور مردہ دلوں کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور گرمائے گی۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

# دیباچہ

اٹھارھویں صدی کا نصف آخر اور انیسویں صدی کا دور عالم اسلام کے لیے ایک کٹھن اور مشکل دور کی حیثیت سے گزرا ہے۔ ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطانؒ نے شہادت پائی اور اسی سال ترکی کے بیڑے کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا، اسی لیے ٹیپو سلطانؒ کی قبر پر یہ عبارت تحریر ہے:

'روم اور ہندوستان کی عظمت غُروب ہوگئی'

اسی پُر آشوب سال میں بحیرۂ کیسپین اور بحیرۂ اسود کے درمیان واقع داغستان کے ایک غیر معروف قصبے میں امام شاملؒ پیدا ہوئے جنھوں نے تقریباً پچاس سال تک رُوسی استعمار کو مسلم آبادیوں پر مسلّط ہونے سے روکے رکھا۔

تحریک آزادی کا یہ خونچکاں باب برّصغیر کے مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل رہا۔ اس جدوجہد کا یہ پہلو خاصا اہم ہے کہ داغستان کے جنگلوں اور پہاڑوں میں لڑی جانے والی یہ گوریلا جنگ عالمِ اسلام میں منفرد نوعیّت کی حامل تھی۔ بے سروسامان داغستانیوں کو رُوسیوں کی منظّم اور کثیر التعداد افواج کا سامنا کرنا پڑا تھا اور انھوں نے بے سروسامانی کے باوجود رُوسی قوت کے آگے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کر دیا تھا۔

گوریلا جنگ نے بیسویں صدی میں دوسری جنگ عظیم کے بعد سے خاصی اہمّیت اختیار کر لی ہے۔ ویت نام اور لاطینی امریکہ میں لڑی جانے والی جنگوں کی وجہ سے مغربی فوجی مُصنفین نے اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی ہیں۔ آج کل کے تکنیکی دور میں بڑی طاقتوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے کئی اقوام نے گوریلا جنگ کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہوچی منہ نے پہلے فرانسیسیوں اور پھر امریکیوں کو گوریلا جنگ ہی کے ذریعے نیچا دکھایا۔ الجزائری سرفروشوں نے بھی اسی طریقۂ جنگ کو اپنا کر اپنے وطن کو آزاد کرایا۔ امام شاملؒ کی حیثیت اس

میدان میں پیش رو کی تھی۔ انہیں بجا طور پر عالم اسلام کا عظیم مجاہد قرار دیا گیا ہے۔ وہ مکمل طور پر فتح سے ہم کنار تو نہ ہوئے لیکن مظلوم اقوام کے لیے ایک ایسا لائحہ عمل چھوڑ گئے جو آج بھی ان کی رہنمائی کرسکتا ہے۔

زیر نظر کتاب کے مُصنف جناب محمد حامد صاحب مبارک باد کے مُستحق ہیں کہ انھوں نے فنونِ حرب کے ایک ایسے پہلو پر قلم اٹھایا ہے جس کی اہمیّت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اس کتاب کا انداز خاصا دلچسپ ہے۔ تاریخی حقائق اس طرح پیش کیے گئے ہیں۔ کہ مُصنف نے جذباتی طرز تحریر کو جگہ دیے بغیر مُوثّر انداز میں اپنی بات قارئین تک پہنچائی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ امامؒ کے زندگی کے واقعات اس قدر دلچسپ اور حیرت انگیز ہیں کہ عام قاری پڑھتے ہوئے کہیں اُکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ اسے مسلمانوں کی فوجی تاریخ میں مُفید اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

میجر جنرل (ریٹائرڈ) فضلِ مقیم خاں
وزارتِ دفاع، راولپنڈی

# حرفِ آغاز

سب سے پہلے اس ذات باری تعالٰی کا ہزار ہزار شکر اور احسان ہے جس نے مجھے یہ کتاب لکھنے کی توفیق اور ہمت عطا کی۔

حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس ہماری رہنمائی کے لیے آفتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔اس کی ضیاباریوں کے طفیل مسلمانوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں عزم و ہمت کی قندیلیں روشن کیں جو کڑے وقتوں میں ہماری حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ یوں تو پچھلی صدی میں مسلمانان برصغیر پر کئی کڑے وقت آئے لیکن ۱۸۳۱ء اور ۱۸۵۷ء کے دو سال ہماری تاریخ آزادی میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ۱۸۳۱ء میں معرکۂ بالاکوٹ پیش آیا اور جدوجہد آزادی کا ایک روشن ماہتاب سید احمد شہیدؒ اور ان کے ساتھیوں کے گروہ کی شکل میں میدان بالاکوٹ میں غروب ہو گیا۔ جدوجہد کا ایک باب یقیناً ختم ہو گیا لیکن یہ داستان جاری رہی اور ۱۸۵۷ء میں وہ چنگاریاں جو مدت سے دبی ہوئی تھی، نئے سرے سے بھڑک اٹھیں۔ قریب تھا کہ برطانوی سامراج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سرزمین سے رخصت ہو جاتا لیکن شاید اللہ تعالٰی کو مسلمانانِ برصغیر کا مزید امتحان مقصود تھا۔ ۱۸۳۰ء سے ۱۸۵۷ء تک کا عرصہ برِصغیر میں جدوجہد آزادی کا نسبتاً خاموش دور سمجھا جاتا ہے۔ بالاکوٹ سے جو مجاہدین بچ نکلے وہ اس دور میں انگریزوں کے لیے بار بار خطرے کی علامت بنتے رہے۔ ۱۸۶۳ء میں امبیلا کی جنگ میں انگریزوں کی شکست اور عظیم جانی نقصان نے ثابت کر دیا کہ انگریزوں کے یہ خطرات بے بنیاد نہ تھے لیکن مجموعی طور پر انیسویں صدی کا یہ دور (۱۸۳۱ـ۱۸۵۷ء) خاموش ہی گزرا ہے۔ دوسری طرف اس دور میں پہاڑوں کے سلسلۂ پامیر کے اُس پار داغستان میں مجاہدین زار روس کی فوجوں سے برسرِ پیکار تھے۔ ان کی داستان جدوجہد ہم تک بہت کم پہنچ سکی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان مجاہدین نے

گوریلا جنگ کے ذریعے امام شاملؒ کی قیادت میں زار روس کی فوجوں کو ناکوں چنے چبوائے۔
ایک روسی جنرل ویلیمنوف کے بقول:

''ان مہمات میں روس کی فوجوں کا جو جانی نقصان ہوا اور جتنا عظیم لشکر ان کارروائیوں میں تہ وبالا ہو کر رہ گیا اس کی مدد سے ہم جاپان سے لے کر ٹرکی تک کا علاقہ فتح کر سکتے تھے۔''

امام شاملؒ (۱۷۹۹ تا ۱۸۷۱ء) کی عظیم شخصیت بحیثیت ایک مجاہد کبیر برصغیر میں متعارف نہیں ہوئی۔ انھوں نے جس طرح نصف صدی تک ایک ایسے لشکر کا مقابلہ کیا جسے روس کے بہترین فوجی جرنیلوں کی قیادت میسر تھی اور کئی بار مکمل شکست کے باوجود جس طرح نئے سرے سے مجاہدین کی تنظیم کی، وہ تاریخ اسلام کا انتہائی روشن باب ہے۔ انھوں نے جنگ کے مختلف ادوار میں جس فوجی مہارت سے مجاہدین کی رہنمائی کی اور جس طرح زار رُوس کے بڑے بڑے لشکر تہس نہس کیے وہ چھاپہ مار جنگ کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ بجا ہوگا اگر امام شاملؒ کو عالم اسلام کا ایک عظیم مجاہد قرار دیا جائے۔

مجھے امام شاملؒ اور سید احمد شہیدؒ کی شخصیت کے کئی پہلوؤں میں مُماثلت نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم کی روشنی میں اصلاح اور جہاد کی تحریکوں کے علمبرداروں کی زندگی میں آپ کو ہر جگہ زمان و مکان کے بُعد کے باوجود کئی پہلو مشترک نظر آئیں گے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کے علم و عمل کا منبع اور سرچشمہ قرآن پاک کی انقلابی دعوت ہے۔ سید احمد شہیدؒ نے جسمانی اعتبار سے خاصی پُر مشقّت زندگی بسر کرنے کی مشق بہم پہنچائی تھی۔ امام شاملؒ کا بھی ذاتی رجحان جسمانی مشقّت اور جفاکشی کی طرف تھا۔ وہ داغستان کے سخت جان لوگوں میں شہ سواری اور نشانہ بازی میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے اور اقبال کے اس شعر کے مصداق تھے

امیر قافلہ سخت کوش و پیہم کوش
کہ درقبیلۂ ما حیدری ز کراری ست

سید احمد شہید نے جہاد کی دعوت دینے سے پہلے معاشرے کی عام برائیوں کی طرف توجہ

دی تھی۔ امام شاملؒ نے بھی سب سے پہلے ''عادات'' یعنی زمانۂ جاہلیت کے رسوم و رواج ختم کرنے پر زور دیا تھا اس کے بعد ہی لوگوں کو جہاد پر ابھارا تھا پھر جہاں سیدؒ صاحب کی تحریک میں طبقۂ عوام کی اکثریت تھی۔ وہاں امامؒ کا ساتھ دینے والوں میں سادہ دل پہاڑی دہقانوں ہی کی اکثریت تھی۔ ہمیں داغستان کے ان سخت کوش مجاہدین کو داد دینی چاہیے، جنھوں نے تقریباً پچاس سال کے عرصہ تک مسلح جدوجہد کے ذریعے زارِ روس کی افواج قاہرہ کا مقابلہ کیا، اپنے گھربار لٹوائے، اپنے بچوں اور عورتوں سمیت آگ میں زندہ جل مرے لیکن زار کے سپاہیوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے۔ ان کے باغات اور ان کے جنگل اُجاڑے گئے، ان کے کھلیانوں کو آگ لگادی گئی، ان کی روزی کے تمام ذرائع بند کرنے کی کوشش کی گئی لیکن ان تمام ظالمانہ اقدامات نے ان کے عزم و ہمت میں کسی قسم کی کمی نہیں آنے دی۔

مختصراً یہ وہ افراد تھے جنھوں نے کسی بیرونی امداد یا توپ خانے کی مدد کے بغیر (سوائے ان توپوں کے جو وہ دشمن سے چھین سکے) صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ذات پر گہرے ایمان کی وجہ سے نصف صدی تک رُوس کی عظیم طاقت کا مقابلہ کیا۔ وہ طویل عرصے تک روس کی طاقت کا مذاق اُڑاتے رہے، اس کے بڑے بڑے لشکروں کو تہس نہس کرتے رہے، روسی علاقے تک یلغار کرتے رہے اور روس کی عددی قوّت، سرمایہ اور فوجی برتری، کوئی چیز بھی ان کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکی۔ انھوں نے امام شاملؒ کی قیادت میں ہزاروں کے لشکر کو شکست دی اور یہ ثابت کر دیا کہ:

﴿ كَم مِّنۡ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةً كَثِيرَةًۢ بِإِذۡنِ ٱللَّهِ ﴾ (البقرہ:۲۴۹)

''کتنے ہی کم تعداد رکھنے والے گروہ بڑے گروہوں پر اللہ کے حکم سے غالب آتے رہے ہیں۔''

ان کی شجاعت کی داستانیں ان کے خون سے قفقاز کے پہاڑوں پر کندہ ہیں لیکن وہ دُنیا کے سامنے بہت کم آسکیں۔ اگر عزم و ہمت کی یہ داستانیں جو امام شاملؒ اور ان کے ساتھیوں نے اپنے عمل اور قربانیوں سے لکھی ہیں کسی بھی حساس دل میں حوصلے اور عمل کی

کوئی کرن پیدا کر سکیں تو میں سمجھوں گا کہ میری یہ حقیر محنت رائیگاں نہیں گئی۔

مناسب ہو گا اگر میں اس کتاب کو لکھنے کے محرکات کے بارے میں کچھ بتاؤں۔ ممکن ہے کہ ظاہر پرست اسے چنداں اہمیت نہ دیں لیکن ذاتی طور پر میں اسے امامؒ کا روحانی تصرف سمجھتا ہوں۔ امامؒ کا تعلق خواجہ نقشبندؒ کے سلسلے سے ہے اور وہ داغستان میں تحریک مُریدیت کے امام تھے۔ میں خود سلسلۂ نقشبندیہ میں مرشد عبدالمالک صدیقی نقشبندی مرحوم و مغفور سے بیعت رکھتا ہوں اور یہ میری عین سعادت ہے کہ میں اس سلسلے سے متعلق امام شاملؒ کے بارے میں کچھ لکھ سکا۔

دنیاوی اسباب یوں بہم ہوئے کہ سقوط ڈھاکہ کے دلگداز واقعے کے بعد میں پاکستان ملٹری اکیڈمی کی لائبریری میں خاصا دل گرفتہ بیٹھا تھا۔ کتابوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے ایک کتاب میں امام شاملؒ کی تصویر نظر آئی۔ ان کی آنکھوں میں چمک پر وقار اور حوصلہ مند چہرے نے مجھے خاصا متاثر کیا۔ کتاب الٹ پلٹ کر دیکھی تو ان کے بارے میں خاصا مواد مل گیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ مزید معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں جو مواد جہاں کہیں سے مل سکا، حاصل کیا گیا، بسا اوقات چند سطور کے لیے کتنی ہی کتابوں کی گرد جھاڑنی پڑی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ یہ محنت ٹھکانے لگی۔

کتابیں فراہم کرنے، موضوع سے دلچسپی لینے اور حوصلہ افزائی کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ تاہم کچھ لوگوں کا تذکرہ نہ کرنا ناسپاسی میں داخل ہو گا۔ ڈاکٹر صمد شاہین صاحب نے نہ صرف چند اہم کتابوں کی نشان دہی کی بلکہ خاصی حوصلہ افزائی فرمائی۔ عبداللطیف الفت صاحب نے کئی کتابیں مستعار دیں اور برابر دلچسپی لیتے رہے۔ عبدالقدوس ہاشمی صاحب لائبریرین، ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد اور، معروف ریسرچ سکالر ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب نے بھی ہر ممکن مدد دی۔ ڈاکٹر ریاض الاسلام صاحب، صدر شعبۂ تاریخ اور ڈاکٹر محمد صابر صاحب صدر شعبۂ اسلامی تاریخ کراچی یونیورسٹی نے بھی بے حد مدد کی۔ ڈاکٹر ریاض الاسلام صاحب نے ڈاکٹر محمد صابر صاحب کے پاس امام شاملؒ پر ایک ترکی کتاب کی

اطلاع دی اور بعد میں ان سے حاصل کر کے بھجوائی۔ میجر وارث کریمی صاحب نے جو ترکستان کے رہنے والے ہیں، بڑی محنت سے کتاب کا سیاق وسباق دریافت کیا۔ کرنل سید نصیرالدین نے (جو اِن دنوں پاکستان ملٹری اکیڈمی میں ڈائریکٹر آف سٹڈیز ہیں) کتاب کے بارے میں خاصی دلچسپی کا اظہار کیا اور میری حوصلہ افزائی کی جن دنوں میں نے یہ کتاب لکھی وہ میرے صدر شعبہ تھے۔ ونگ کمانڈر انعام الحق لائبریرین، نیشنل ڈیفنس کالج، راولپنڈی نے بھی کچھ اہم کتابوں کی نشاندہی میں خاصی دلچسپی لی جس کے لیے میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے پیش لفظ اور میجر جنرل (ریٹائرڈ) فضل مقیم خان، سیکرٹری وزارت دفاع نے دیباچہ لکھ کر کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا جس کے لیے میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔ میرے لیے ان کے تعریفی کلمات ان کی ذرّہ نوازی ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔ مولانا ظفر احمد انصاری صاحب، ممبر قومی اسمبلی و رابطہ عالم اسلامی نے مجھے امام شامل ؒ کے پوتے الاستاذ الشیخ سعید شامل کا اتا پتا بتایا، موصوف مولانا انصاری کے پرانے دوست ہیں۔ ان دنوں مدینہ منورہ میں مقیم ہیں۔ استنبول کے مؤقر جریدے اسلامی مدنیت کے ایڈیٹر زاہد صاحب نے ترکی زبان میں امام شاملؒ پر دو کتابیں بھجوائیں۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی کی لائبریری کا سٹاف بھی میرے شکریہ کا مستحق ہے۔ کاکول میں میرے قیام کے خوشگوار ترین لمحے لائبریری میں بسر ہوئے اور وہیں مجھے یہ کتاب لکھنے کا خیال آیا۔ نور العین نوید صاحب اور مشتاق جیلانی صاحب نے جو میرے کرم فرما ہیں، مسودے کو بڑی محنت سے پڑھا اور نہایت مفید مشوروں سے نوازا۔ کتاب کے آخر میں دیا گیا اشاریہ منور ممتاز قریشی صاحب ایم۔ ایل۔ ایس کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ میں ان سب حضرات کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ ان کی کرم فرمائیوں کے بغیر یہ کتاب اپنی موجودہ شکل میں سامنے نہیں آسکتی تھی۔

۱۳ جنوری ۱۹۷۴ء

محمد حامد

# دیباچہ طبعِ سوم

اللہ کریم کا ہزار ہزار احسان ہے کہ "امام شاملؒ" کی مقبولیت توقع سے کہیں بڑھ کر ہُوئی گزشتہ کئی برسوں سے یہ کتاب اُردو میں نہ چھپ سکی تھی۔ فیروزسنز نے اس سے پہلے اس کے دو ایڈیشن چھاپے تھے۔ اس دوران اس کا عربی ایڈیشن ابوظہبی سے شائع ہوا۔ ترکی ایڈیشن کے زیرِ طبع ہونے کی اطلاع تین برس پہلے تھی ممکن ہے اب تک چھپ چُکا ہو۔ پشتو ایڈیشن کی تیاری مکمل ہے۔ اس کی کتابت بھی ہو چکی ہے۔ اس پر غیر مُلکی جرائد میں تبصرے بھی ہوئے۔

روس میں تبدیلی کی نئی لہر دراصل اسلام کے خلاف یورپ اور روس کے اتحاد کا ایک نیا دور ہے اور بس۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے اہل علم اس تبدیلی پر خوش ہونے کے بجائے اس کے مضمرات پر غور کریں۔ افغانستان نے نہ صرف رُوس بلکہ خود یورپ کو یہ احساس دلایا ہے کہ اگر وہ متحد نہ ہوئے تو اسلام ایک بھرپُور قوت کی حیثیت سے اُبھرے گا۔ کمیونزم ہی اپنے دن پُورے نہیں کر چُکا، تہذیب مغرب بھی اپنی آخری سانسیں لے رہی ہے، یہ الگ بات ہے کہ مغرب کے دانشور ابھی تک مطمئن ہیں کہ تاریخ اپنا آخری موڑ مُڑ چکی ہے اور مغرب کے تصورات نے روس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور اب پُوری دنیا پر اسی کا سکہ چلے گا۔ نیویارک کی بلند و بالا عمارتوں سے قوموں کی تقدیروں کے فیصلے کرنے والی نئی عالمی سلطنت کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ قوموں کو قرضوں کی آہنی گرفت میں گرفتار کر کے، ان کے حکمرانوں کو پُرتعیش زندگی کی چاٹ لگا کر اور رشوتیں دے کر اپنے چنگل میں گرفتار کیے ہُوئے ہیں۔ اقوامِ عالم کے اعلیٰ ترین دفتری کارندے ان عالمی اداروں کے مُنشیوں اور بہی کھاتے لکھنے والوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ دُنیا بھر کے دانشوروں کو کسی نہ کسی چکر میں ڈال کر اپنی مرضی کی تخلیقات لکھوا رہے ہیں۔ اس تمام صورت حال میں صرف ایک دیوانگی ہے جو ان کے ہتھکنڈوں سے نجات کا

ذریعہ بن سکتی ہے۔ افغانستان کے مردِ مجاہد کے جُنون نے کئی راہیں کھولی ہیں اور آئندہ برسوں میں بھی صرف پاگل پن ہی کے ذریعے وہ کھیل ختم کیا جا سکتا ہے جو صدیوں سے سرمایہ دار اپنی تمام تر چالاکی اور ہوشیاری سے کھیل رہا ہے۔

امام شاملؒ جنوں کے اس قافلے کے اہم قافلہ سالار تھے۔ روس کی افواج کو قفقاز کے میدانوں اور پہاڑوں سے موت کی وادی میں دھکیلنے اور زارانِ روس کے تمام منصوبوں کو تہ و بالا کرنے میں ان کی ولولہ انگیز قیادت کا دخل تھا۔ افغانستان کے مجاہدین کی تمام تر قیادت امام شاملؒ کے کام اور ان کی محیرّ العقول زندگی سے پُوری طرح آگاہ ہے۔ امام شاملؒ کا عربی ایڈیشن میدانِ جہاد میں جنگ کے اگلے مورچوں میں بھی پڑھا گیا ہے۔ کیونکہ اکثر افغان طلباء اور علماء عربی پڑھنے کی اچھی استعداد رکھتے ہیں۔

افغانستان ان شاء اللہ جلد آزاد ہوگا اور ان شاء اللہ مسلمانوں کی نشأۃِ ثانیہ کے اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھے گا۔ مُستقبل کے پردے میں کیا کچھ ہے یہ سب اللہ کریم کے اختیار میں ہے۔ اللہ تعالےٰ ملّت اسلامیہ کی خدمت کے عظیم کام کے لیے ہمیں چُن لے اور اپنی ذات کے حصار سے باہر نکل کر حصارِ ملت کی پاسبانی اور اس کی تقویت کے لیے کام کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ آمین۔

محمد حامد

۵ جنوری ۱۹۹۰ء

# دیباچہ طبعِ چہارم

اللہ رب العزت کا ہزار ہزار شکر ہے کہ امام شاملؒ کے چوتھے ایڈیشن کی اشاعت ہو رہی ہے۔ امام شاملؒ جن کے نام سے آج سے پچیس سال پہلے پاکستان میں محدود سے چند لوگ متعارف تھے، اس کتاب کی اشاعت کے بعد پاکستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں ان کا وسیع پیمانے پر تعارف ہوا۔ اس کے انگلش، سندھی اور عربی ایڈیشن نکلے۔ چند برس پیشتر دہلی سے اس کی اشاعت ہوئی اور مجھے امید ہے کہ اس کتاب نے بھارت کے مسلمانوں میں بھی ولولۂ تازہ پیدا کیا ہوگا۔ ابوظہبی کا عربی ایڈیشن بھی پوری دنیا میں پڑھا گیا۔ یہ غلط نہ ہوگا اگر میں اقبالؒ کا ہم زبان ہو کر یہ کہوں ۔

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمر قند

یہ سب صرف اور صرف اللہ رب العزت کی کرم نوازیوں کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔ اس پذیرائی کی اصل کلید بارگاہِ ربوبیت ہی میں ہے۔ اس دوران میں چیچن جانبازوں اور مجاہدوں نے اپنے کارناموں سے پوری دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائے رکھی۔ انھوں نے جس طرح روسی لشکروں کو تہس نہس کیا۔ جس طرح گروزنی کو روسی افواج کا قبرستان بنایا وہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ کیا عجب انھیں ابھی کتنے اور معرکوں میں اترنا ہے اور شجاعت کے کتنے ہی زرّیں ابواب کو اپنے خونچکاں ہاتھوں سے رقم کرنا ہے۔

ہم ایک پر آشوب دور سے گزر رہے ہیں۔ غزوۂ ہند جس کی پیش گوئی حضور اکرم ﷺ نے فرمائی تھی، قرائن اس کے بہت ہی قریب ہونے کا پتہ دیتے ہیں۔ فلسطین خون میں نہا رہا ہے اور کیا عجب کہ کتاب چھپتے چھپتے دنیا کا نقشہ کیا سے کیا ہو جائے ۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

آنے والے دور میں مسلمانوں کو جو چیلنج درپیش ہے اس میں جہاد کے راستے کو اپنائے بغیر اور لیلیٰ شہادت کو ہم آغوش کیے بغیر آبرومندانہ زندگی گزارنا ہرگز ممکن نہیں۔ میں قارئین سے یہ عرض کروں گا کہ خدارا اس نئے چیلنج کو سمجھیں اور اس کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں۔

بین الاقوامی سازشیں اپنے عروج پر ہیں اور ہمارے ذرائع ابلاغ ہمیں مغرب کا مستقل غلام بنانے کے درپے ہیں۔ اس نے ہمارے اندر بے یقینی کی سی کیفیت پیدا کردی ہے۔ امام شاملؒ کے مطالعہ سے آپ کے اندر ایمان ویقین کی کوئی رمق پیدا ہوئی تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔ اللہ کرے کہ یہ کتاب نئے معرکے میں جو درپیش ہونے والا ہے اہلِ حق کے عزم وحوصلہ کو تازہ کرنے کا سبب بنے۔

وما توفیقی الا باللہ

محمد حامد

راولپنڈی یکم جنوری ۲۰۰۱ء

# نقشہ داغستان اور ملحقہ علاقے

## باب اوّل:

# پس منظر

امام شاملؒ اور ان کی تحریک کا ذکر کرنے سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ میں قفقاز [1] (کاکیشیا) کے جغرافیائی محلِ وقوع اور ان جگہوں کا مختصر ذکر کروں جن کے نام اس کتاب میں بار بار آئیں گے۔ اس طرح ان تمام واقعات کو سمجھنا نسبتاً آسان رہے گا جو امام شاملؒ کی زندگی میں پیش آئے۔ ایک مختصر جغرافیائی پس منظر کے بغیر یہ واقعات شاید اتنی وضاحت سے سمجھ میں نہ آسکیں۔

> ''قفقاز کی حیثیت ایک ایسے عظیم قلعے کی ہے جو قدرتی اعتبار سے محفوظ ہو، مختلف فوجی تعمیرات کے ذریعے اس کی حفاظت کے انتظامات مزید پختہ ہوں اور اسے بڑی تعداد میں فوج کے ذریعے مستحکم بنایا گیا ہو۔ ایسی صورتِ حال میں سُوجھ بوجھ سے عاری شخص ہی اس جگہ کو تسخیر کرنے میں جلد بازی سے کام لے گا۔ ایک عقل مند کمانڈر حکمت عملی کو کام میں لاتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھے گا اور اپنا راستہ صاف کرتے ہوئے اس جگہ پر قبضہ کرے گا۔''

جنرل ویلمنوف (جو قفقاز میں رُوسی افواج کا چیف آف سٹاف تھا)، کی یہ تحریر قفقاز کی فوجی اعتبار سے اہمیت پر کسی حد تک روشنی ڈالتی ہے۔

### جُغرافیائی محل وقوع:

بحیرۂ کیسپین اور بحیرۂ اسود کے درمیان شمال مغرب سے جُنوب مشرق تک پھیلے ہوئے پہاڑوں کے فلک بوس سلسلوں کا نام قفقاز ہے۔ مرکزی سلسلۂ کوہ اس علاقے کا اہم حصہ ہے۔

---

[1] قفقاز کو انگریزی میں Caucasus کہتے ہیں۔ ترکی میں بھی اسے قفقاز ہی کہا جاتا ہے اور یوں لکھا جاتا ہے: Kavkaz، اُردو میں اسے عام طور پر کوہِ قاف کہتے ہیں۔

پہاڑوں کی اس عظمت نے یہاں کے باشندوں میں بھی کردار کی عظمت کو جنم دیا ہے۔ جس طرح بلند و بالا پہاڑوں کی تسخیر ایک مشکل کام ہے، اسی طرح یہاں کے باشندوں کو بھی مُسخّر کرنا کچھ آسان کام نہیں۔ ایک رُوسی شاعر لرمونٹوف ان کے بارے میں کہتا ہے:

اے پہاڑوں میں رہنے والے قبیلو!

آزادی تمھارا خُدا ہے اور جدّ و جہد تمھارا قانون حیات

تم دوستی کے مُعاملے میں شدید ہو اور بدلہ لینے میں شدید تر

تمھارے نزدیک نیکی کا بدلہ نیکی ہے اور بدی کا بدلہ بدی

اور تمھاری نفرت بھی تمھاری محبت کی طرح غیر محدُود ہے

ان لوگوں کے بارے میں بلا مُبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کوہستانوں کی تخلیق ہیں اور وہ ان کوہستانوں کی آزادی کے لیے اس بے جگری سے لڑے کہ انھوں نے ان پہاڑوں کو قریب قریب ناقابلِ تسخیر بنا دیا تھا۔ ایک عجیب بات جو اس سلسلۂ کوہ کے مُطالعے سے ہمارے سامنے آتی ہے، یہ ہے کہ بلند و بالا چوٹیوں' تنگ دروں اور گھنے جنگلوں نے جہاں ان میں رہنے والے قبائل کو آزادی کا جذبہ عطا کیا' وہاں ان میں ایک وسیع تر اتحاد کو مشکل بھی بنا دیا تھا۔

پہاڑوں کے اس عظیم سلسلے کی کل لمبائی ۶۵۰ میل ہے جس میں صحیح معنوں میں پہاڑی علاقہ ۴۰۰ میل تک پھیلا ہُوا ہے۔ اس کے علاوہ کیپیین تک باکو کے قرب و جوار میں پھیلے ہوئے علاقے کی لمبائی ڈیڑھ سو میل ہے اور دُوسری طرف بحیرۂ اسود تک تقریباً سو میل کا علاقہ ہے جس کی نوعیت سطح مرتفع کی سی ہے۔ اس کی چوڑائی تقریباً سو میل ہو گی۔ درمیان میں یہ چوڑائی کافی حد تک تنگ ہو جاتی ہے۔

یہ تمام علاقہ جو قُدرتی اعتبار سے تین حصّوں میں مُنقسم ہے' جد وجہد آزادی کے اعتبار سے بھی تین مختلف حصّوں میں بٹا ہوا ہے۔ البرز سے لے کر بحیرۂ اسود کے ساحل تک مغرب کی جانب جنگلات پر مشتمل علاقہ ہے جہاں زمین کی سطح سمندر کی سطح سے ۱۰ ہزار فٹ تک بلند

ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں کے رہنے والے مقامی قبائل نے جنھیں عام طور پر سرکیشین کہا جاتا ہے' اٹھارھویں صدی کے اختتام سے لے کر ۱۸۶۴ء تک شمالی حملہ آوروں کے خلاف خونریز جنگ کا سلسلہ جاری رکھا۔ مشرق کی جانب چیچنیا اور داغستان کے دیگر قبائل نے قریباً اتنا ہی عرصہ رُوسیوں کے خلاف جہاد کا علم بلند کیے رکھا۔ بنجر سطح مرتفع پر رہنے والے ان قبائل کو اپنی جدّوجہد آزادی میں خاصی کامیابیاں بھی نصیب ہوئیں۔ لیکن درمیانی علاقے میں جہاں پہاڑوں کا سلسلہ خاصی بلندی تک گیا ہے اور جہاں تقریباً ۱۰۰ میل تک کوئی درّہ بھی ۱۰ ہزار فٹ سے کم بلندی پر واقع نہیں، رُوسیوں کو بہت کم مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان قبائل نے کئی بار گوریلا جنگ کی لیکن جہاں تک باقاعدہ جنگ کا تعلق ہے ان کی طرف سے رُوسیوں کو بہت کم مُخالفت کا سامنا رہا۔ محاذ کے دو مختلف علاقوں کے درمیان ایک خلا تھا جو مجاہدین کی کوششوں کے باوجود پُر نہ ہوسکا اور اس طرح رُوسیوں کے لیے آمدورفت کی راہ شمال سے جنُوب تک کھلی رہی۔ یہ جارجین سڑک مجاہدین کے لیے خاصی مشکلات پیدا کرنے کا باعث بنتی رہی۔ اسے نظر انداز کیے بغیر اس دور کی تاریخ کو اچھی طرح نہیں سمجھا جاسکتا۔

جارجین قوم:

پہاڑوں کے بڑے سلسلے کی جنوبی جانب جارجین نسل کے باشندے آباد تھے (سٹالن اور اس کا رفیق کار بیریا دونوں جارجین تھے) ان کی مُدافعت کے بہانے رُوسی افواج پہلی بار ان پہاڑوں کو عبُور کرکے آگے بڑھیں۔ یہ باشندے زارِرُوس کے وفادار رہے۔ مزید جنوب میں مشرق کی طرف مسلم خوانین کے علاقے اور ایران کی باج گزار ریاستیں تھیں اور مغرب کی جانب ترکی کے پاشاؤں کے آزاد علاقے تھے۔ رُوس کے عزائم یہ تھے کہ قفقاز میں ایک طرف ان مغربی قبائل کو مسخر کیا جائے جو تُرکی کے حلیف تھے اور دُوسری طرف چیچنیا اور داغستان میں قبائل کو زیر کیا جائے۔ اس کے بعد ٹرانس کاکیشیا میں جارجین نسل کے باشندوں کو مُتحد کرکے انھیں ایران اور تُرکی کے خلاف دفاع کے قابل بنایا جائے اور اس طرح ان کے ذریعے اپنی سرحدوں کو محفوظ کیا جائے۔ اس کا ایک اور مقصد بھی تھا اور وہ یہ کہ ہزاروں کی تعداد میں تُرک

افواج کو ایشیائے کوچک میں مصروف رکھ کر یورپ میں ترکی کے دباؤ کو کم کیا جائے قفقاز میں جنگوں کا سلسلہ تقریباً ۶۰ برس تک جاری رہا۔ اس عرصے میں مختلف قبائل سے رُوسیوں کو نبرد آزما ہونا پڑا۔ ان قبائل کے مختصر تذکرے سے یہ تاریخ واضح ہو کر سامنے آجائے گی۔

مشرقی قفقاز:

مشرقی قفقاز کو عرب مؤرخ العزیزی نے جبل الالسنہ یعنی زبانوں کا پہاڑ قرار دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس علاقے میں ۳۰۰ مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اس تعداد کو مُبالغہ آمیز سمجھا جائے تو بھی ہمیں موجودہ دور کے یورپی ماہرین زبان کے اس اندازے کو درست ماننا پڑے گا جو انھوں نے داغستان کے بارے میں لگایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ داغستان میں ۴۰ زبانیں بولی جاتی ہیں اور ان میں سے اکثریت کا ایک دُوسرے سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ شاید ہی کرۂ ارض پر کوئی اور جگہ ایسی ہو جہاں مختلف زبانیں بولنے والے قبائل اور نسلیں اتنی وسیع تعداد میں آباد ہوں۔ جیسے جیسے وادیاں تنگ تر ہوتی چلی جاتی ہیں اور جُوں جوں علاقے دُشوار گزار ہوتے جاتے ہیں زبان کے اختلافات اور نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ زبان اور دُوسرے اختلافات کی مختلف وجوہات بیان کی گئی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ سکندر اعظم نے اپنے مفتوحہ علاقوں کے تمام مُجرموں کو یہاں بھجوا دیا۔ یہاں کی زمین اور شدید آب وہوا کی وجہ سے یہ علاقہ ''کالا پانی'' کی حیثیت رکھتا تھا۔ چونکہ یہ مُجرم مختلف علاقوں سے آئے ہوئے تھے اس لیے یہاں مختلف زبانیں بولی جانے لگیں۔ برطانوی دور میں جزائر انڈیمان کا حال بھی یہی تھا۔ ایک دُوسری توجیہہ جو اس وجہ سے بھی زیادہ مُناسب لگتی ہے کہ سکندر اعظم اس علاقے سے سیکڑوں میل دُور رہا ہے یہ ضرور ہے کہ اس پر مختلف فاتحین نے قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کبھی فاتح مفتوح بنتے رہے اور کبھی وہ کامیاب ہوتے رہے۔ ان تغیّرات کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی وادیوں میں جو خاصی محفوظ بھی تھیں مختلف علاقوں کے افراد آ کر رہنے لگے۔ یہاں انھوں نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا اور ذرائع رسل ورسائل محدود ہونے کی وجہ سے ان کی زبان بھی باہر کے اثرات سے محفوظ رہی۔ اگر برازیل کے جنگل ناقابل عُبور ہونے کی

وجہ سے زبانوں کی کثرت کا باعث ہوں تو یہ صُورت حال زیادہ تعجب خیز محسوس نہ ہوگی۔

داغستان کا علاقہ:

داغستان کے علاقے کو تفصیل سے جاننا اس لیے ضروری ہوگا کہ بڑے بڑے معرکے اسی علاقے میں ہوئے تھے۔ یہ علاقہ ایک بلند سطح مرتفع پر واقع ہے جہاں پہاڑوں میں دریاؤں نے ہزاروں فٹ گہرائی تک کی زمین کاٹی ہے۔ آور اور آندی دریاؤں کے درمیان بوگوس سلسلۂ کوہ کی تین چوٹیاں ایسی ہیں جو تیرہ ہزار فٹ سے کہیں زیادہ بلندی پر ہیں۔ پھر جنوب مشرق میں دیولتی داغ سلسلے کی دو چوٹیاں بھی تیرہ ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہیں۔ دیولتی داغ ۱۲ ہزار ۴سو فٹ کی بلندی پر ہے اور اس سے آگے اسی سمت میں شالبوز داغ ۱۳۶۷۹ فٹ اور شاخ داغ ۱۳۹۵۲ فٹ کی بلندی پر ہے۔ مؤخر الذکر باکو کے صوبے میں واقع ہے۔

یہاں دریاؤں کے دو بڑے سلسلے ہیں جن میں سے سولک دریا جو چار مُعاون دریاؤں سے مل کر بنا ہے، زیادہ مشہور ہے۔ سولک دریا کے مُعاون یہ ہیں: قاضی قوموخ، قرا، آور اور آندی۔ یہ سب دریا شمال اور شمال مشرق کی جانب بہتے ہیں۔ ان دریاؤں کے کنارے بہت بلند ہیں اور یہ کسی جگہ انتہائی گہری سطح پر چٹانوں میں سے ہو کر بہتے ہیں۔ پہاڑوں کے پُر پیچ سلسلوں کے ساتھ ساتھ قفقاز کے دریاؤں نے بھی اس علاقے کو جُغرافیائی اعتبار سے انتہائی دشوار بنا دیا ہے۔ دریاؤں کا دوسرا سلسلہ سمور کا ہے جو قرا اور آور دریاؤں کے پاس ہی سے نکلتا ہے لیکن جُنوب کی جانب مڑ جاتا ہے اور اس کا نچلا راستہ داغستان کی انتہائی جُنوب مشرق کی سرحد بناتا ہے۔

قفقاز کی کُل آبادی جنگ کے دوران تقریباً ۴۰ لاکھ تھی۔ داغستان کی کُل آبادی ۵ لاکھ اور آور قبائل کی ایک لاکھ پچیس ہزار تھی۔ تاریخی اعتبار سے یہ قبائل خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی آبادی بھی خاصی زیادہ تھی اور یہ چیریوات سے لے کر جنوب میں ذاکرتالی کی سرحد تک آباد تھے۔ داغستان کو انھوں نے دو حصوں میں مُنقسم کیا ہوا تھا۔ ان کی زبان دو مختلف بولیوں میں مُنقسم ہے۔ جن کا نام خنزاخ اور انتزوخ ہے۔ یہ دونوں خاصی حد تک ایک دُوسرے سے

مختلف ہیں۔ خنزاخ بولی کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ ہے کہ امام شاملؒ کی زبان یہی تھی۔ قاضی مولا اور ہمزاد بیگ کی زبان بھی یہی تھی۔ امام شاملؒ کے اہم نائبین بھی یہی زبان بولتے تھے۔ داغستان میں عام بول چال کا ذریعہ یہی زبان رہی۔ چونکہ حملہ آور لوگ داغستان میں مرکزی جگہ پر آباد تھے اس لیے ان کی زبان کو دیگر قبائل کے ساتھ تعلق کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ یہ خاصی مشکل زبان ہے۔ "ق" کو چھ مختلف آوازوں میں ادا کیا جاتا ہے اور اسی طرح "ت" کی بھی چار مختلف آوازیں ہیں جن کے لیے دُوسری زبانوں میں اتنے مترادفات نہ مل سکیں گے۔ گرامر کے اعتبار سے بھی یہ خاصی مشکل زبان ہے۔

آورتر کی زبان کا لفظ ہے۔ جس کا مفہوم بے چین اور آوارہ گرد ہے رُوسیوں نے یہ لفظ کو میک قوم سے لیا ہے۔ آورا اپنے آپ کو اس گروہ یا قلعہ بند علاقے سے منسوب کرتے ہیں جس سے ان کا تعلق ہو۔ وہ سب ایک بات پر متفق ہیں کہ وہ مازولال (پہاڑی باشندے) ہیں اور ان کی زبان مارول مائس (پہاڑی زبان) ہے۔ شمالی علاقے کے آورا اپنے جنوبی علاقے میں رہنے والے بھائیوں کو بغلول کہتے ہیں جس کا مطلب غریب اور گنوار ہے۔ یہ تقسیم لسانی بنیادوں پر بھی پوری اُترتی ہے۔ ان لوگوں کے بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ وہی ہُن اقوام ہیں جو یورپ کی تاریخ میں پانچویں صدی عیسوی تک مشہور ہیں۔ بلوچوں کی قدیم تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے اکثر مؤرخین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بلوچوں کا تعلق کاکیشیا سے رہا ہے اور یہ کہ وہ عیسوی سنہ کے ابتدائی حصے میں وہاں سے ہجرت کر کے کرمان اور سیستان کے علاقوں میں آ کر آباد ہُوئے ہیں۔

داغستانیوں کی رہائش:

داغستان میں رہنے والوں نے اپنی آبادیوں کی تعمیر کے وقت دفاعی نقطۂ نظر کو ہمیشہ اہمیت دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے گھر یا تو خاصی بلندی پر بنائے ہیں۔ یا ایسی جگہوں پر جن کے سامنے عمودی چٹانیں یا ایسا پہاڑ ہو جسے عُبور کرنا ممکن نہ ہوتا کہ اچانک حملے سے محفوظ رہ سکیں۔ اراکنی کا قلعہ بند قصبہ ایک نمائندہ حیثیت رکھتا ہے۔ گھر پتھر کے اور عام طور

پر دومنزلہ ہوتے ہیں۔ان میں تعمیر کی پختگی اور سہولت کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے۔اندرونی حصے پر مٹی کا پلستر کیا جاتا ہے اور اس پر سفیدی بھی کی جاتی ہے۔ یہ گھر عام طور پر ایک دائرے کی شکل میں ہوتے ہیں۔ان کی تعمیر اس انداز سے کی جاتی ہے کہ وہ دفاعی مقاصد پورے کر سکیں۔گلیاں اتنی تنگ ہوتی ہیں کہ دو گھڑ سوار ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔کئی جگہوں پر ایک مکان دفاعی چوکی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں پر واقع مدافعین کو ختم کیے بغیر کوئی بھی حملہ آور آگے نہیں بڑھ سکتا۔موجودہ دور کی دُور مار توپوں کے ذریعے یہ دفاعی قصبے آدھ گھنٹے کی گولہ باری سے ختم ہو سکتے ہیں لیکن اُس دور میں یہ مکان کچھ اس انداز سے بنے ہُوئے تھے کہ اُن پر پُرانی دُور مار توپوں کا اثر نہ ہو سکتا تھا۔ یہ صرف اسی طور پر فتح کیے جا سکتے تھے کہ ان پر دھاوا بول دیا جائے۔ لیکن یہ بڑے دل گُردے کا کام تھا۔ کیونکہ ان میں واقع ایک ایک گھر کی حیثیت ایک ایسے مورچے کی تھی جس میں انتہائی بہادُر مرد اور بسا اوقات ان سے زیادہ دلیر عورتیں دفاع کے لیے موجُود تھیں۔

ایندھن کم مقدار میں ملنے کی وجہ سے عمارتیں اس طرح بنائی جاتیں کہ ان میں سُورج موسم سرما کے دوران گرمی پہنچا سکے اور ساتھ ہی ساتھ وہ شمالی تیز ہواؤں سے بھی محفوظ رہ سکیں۔ جہاں تک قرب و جوار میں زرخیز زمین اور پانی کا تعلق ہے یہ چیزیں دُوسرے درجے کی اہمیت رکھتی تھیں۔زرخیز زمین کی کمی کی وجہ سے آبادی کم ہوتی تھی۔اس وجہ سے یہ دفاعی نقطۂ نظر سے کمزور ہو جاتی ہے۔ یہ بات یقیناً قابل توجہ تھی لیکن جہاں تک پانی کی دوری کا تعلق ہے اس بارے میں کم ہی توجہ دی جاتی تھی۔صرف اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ جس مقام پر پانی موجود ہے وہ جگہ محفوظ ہو اور وہاں سے پانی لانے کے راستے کو بھی محفوظ ہونا چاہیے۔پانی لانے کی ذمہ داری پنجاب کے اکثر دیہات کی طرح عورتوں کی تھی۔

داغستانیوں کی خصُوصیات:

داغستان کے مختلف قبائل ایک دوسرے سے خاصی حد تک مختلف واقع ہوئے ہیں۔لیکن ان سب میں کچھ خصُوصیات مُشترک ہیں۔وہ خاصے ذہین، صابر، چست و چالاک، قیافہ شناسی

کے ماہر، عزّت کا تحفظ کرنے والے اور دینی اعتبار سے ایک اچھے مسلمان کی تمام تر خصوصیات کے حامل ہیں۔ کھانے پینے کے معاملے میں میانہ رو ہیں اور بہت کم سوتے ہیں۔ ان میں شجاعت کی خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں اور چیچنیا کے رہنے والوں کی نسبت اگرچہ میدان جنگ میں نسبتاً کم تیز واقع ہوئے ہیں لیکن میدان کارزار گرم ہو تو ان سے زیادہ بے جگری سے لڑنے والے افراد کم ہی ملیں گے۔

داغستان کے رہنے والوں کی ان خصوصیات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ جنگیں ایسے علاقے میں ہوئیں جو خاصی بلندی پر واقع ہیں۔ جہاں درخت بالکل نہیں جہاں زمین کی سطح ہزاروں فٹ بلند ہے اور جہاں کئی چوٹیاں برف کی سطح سے بھی بلند ہیں۔ یہاں دریاؤں کی گزر گاہ کئی جگہ ۳ ہزار فٹ یا اس سے بھی نیچے چلی گئی ہے اور کئی جگہ وادیاں اتنی تنگ ہیں کہ دفاعی قصبے بالکل چھپ جاتے ہیں۔ یہاں پھلوں کے درخت اور مکئی جوار باجرہ وغیرہ خوب ہوتے ہیں۔ زراعت پر کی گئی محنت صحیح معنوں میں بار آور ثابت ہوتی ہے۔ یہاں پہاڑوں کو کاٹ کر مختلف تختے بنائے گئے ہیں اور جس محنت سے آبپاشی کا نظام بنایا گیا ہے وہ قابل دید ہے۔ کئی جگہ بنجر چٹانوں پر مٹی ہاتھوں کے ذریعے پہنچائی گئی ہے۔ آور کے ایک دہقان کی یہ کہانی مُبالغہ آمیز نہیں کہ وہ سویا ہوا تھا اور اس کا کھیت غائب ہو گیا لیکن وہ اُٹھا تو اس کے چوغے کے نیچے موجود تھا۔ داغستانی صحیح معنوں میں مرد کوہستانی ہیں۔ محنتی، چُست اور مُشقّت کو برداشت کرنے کی عادت رکھنے والے ہیں۔ ان کی شکل و شباہت میں خاصے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثریت خوش شکل ہے۔ بلندی پر رہنے والوں کی آنکھیں نیلی، خوب صورت بال، نفیس خد و خال اور رُخسار کی ہڈی کسی حد تک اُبھری ہوئی ہوتی ہے۔

## چیچنیا کا علاقہ:

چیچنیا کے علاقے کی سرحدیں مشرق میں سولاک، مغرب میں بالائی سونجہ اور شمال میں زیریں سونجہ اور حویک سے ملتی تھیں۔ مغرب میں یہ سرحدیں ان پہاڑی علاقوں سے ملتی تھیں جو

داغستان کے آور اور آندین تو ستین اور خوسور اقوام سے آباد تھیں۔ یہ تمام علاقہ گھنے جنگلوں بے شمار ندی نالوں اور بلند بالا پہاڑوں سے گھرا ہُوا ہے۔ ان ندیوں کے کنارے پر چیچن قبائل آباد تھے۔ یہ بھی ان دفاعی قصبوں میں رہتے تھے جہاں بسا اوقات سیکڑوں گھر ہوتے تھے۔ مکان عام طور پر ایک منزلہ ہوتا تھا۔ مکانوں کی چھتیں ہموار ہوتیں اور یہ پُختہ مٹی کے بنے ہوتے تھے۔ ان کی تعمیر میں لکڑی بھی استعمال ہوتی تھی۔ ان گھروں میں قالین، دریاں، تکیے، رضائیاں، تانبے کے برتن اور گھر کی دیگر اشیاء ہوتی تھیں۔ ہر گھر کا اپنا باغ ہوتا تھا۔ جنگل میں صاف کی ہوئی جگہ پر کھیتوں میں مکئی، باجرہ، جوار، جَو اور اسی طرح کی دُوسری اجناس اُگائی جاتی تھیں۔ چونکہ گاؤں میں داغستانیوں کی طرح حفاظتی انتظامات نہیں ہوتے تھے اس لیے اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ گاؤں کی ایک سمت جنگل کے بالکل مُتصل ہوتا کہ خطرے کے وقت عورتیں اور بچے قیمتی سامان کے ہمراہ جنگل میں بھاگ جائیں۔ جنگل میں ایک غالب تعداد میں بڑے بڑے بیچ [1] کے درخت ہوتے تھے اور یہ رُوسیوں کے خلاف مورچوں کا کام دیتے تھے۔ جب تک یہ درخت موجُود رہے اس علاقے پر روسی غالب نہ آ سکے۔ جہاں کہیں روسی جنگل کاٹ سکتے تھے وہیں تک پیش قدمی ممکن تھی اور حقیقت یہ ہے کہ کلہاڑے کی ضرب تلوار کی ضرب سے کہیں زیادہ فیصلہ کُن ثابت ہوئی۔

امام شاملؒ ان درختوں اور جنگلوں کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ان کی حفاظت کے لیے سخت قوانین نافذ کر رکھے تھے۔ اجازت کے بغیر درختوں کے کاٹنے پر سخت سزائیں دی جاتیں۔ عام طور پر درخت کا ایک تنا کاٹنے پر ایک گائے یا بیل جُرمانے کے طور پر دینا پڑتا تھا۔ بعض غیر معمولی واقعے پر سزائے موت تک دی جاتی اور وہ بھی اس طرح کہ مُجرم کو گاؤں کے بیچوں بیچ پھانسی پر لٹکا دیا جاتا اور ایک ہفتے تک یونہی رہنے دیا جاتا

---

[1] اس درخت (Beach) کا نباتاتی نام (Fagus Sylvaticus) ہے۔ یہ درخت پاکستان اور ہندوستان میں کہیں نہیں ملتا۔ یورپ میں قریب قریب سب ممالک میں پایا جاتا ہے۔ یہ خاصا گھنا درخت ہے اور اس کی اُونچائی ۶۰ فٹ سے ۱۵۰ فٹ تک ہوتی ہے۔

تاکہ دُوسروں کو عبرت ہو۔ درختوں کا کاٹنا درحقیقت دشمن کے مقاصد کی تکمیل کرنا تھا اسی وجہ سے اتنی شدید سزا تجویز کی گئی تھی۔

## چیچنیا کا مُعاشرہ:

چیچنیا میں کوئی خاص نظامِ حکومت نہ تھا اور نہ کسی قسم کا طبقاتی امتیاز موجود تھا۔ ہر شخص مساوی حقوق رکھتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی وہ مُعززین قوم کی جُنبش ابرو کا پاس رکھتے تھے۔ شہرت اور ناموری حاصل کرنے کے لیے بہادری کے عظیم کارنامے سرانجام دیتے اور اس ناموری کی وجہ سے معاشرے میں عزت اور اثر ورسُوخ بھی بڑھتا۔ اس کے باوجود کوئی چیچن فرد اپنے علاقے یا ضلع میں پُوری برتری حاصل نہیں کر سکا۔ ہر شخص پیدائشی گُھڑ سوار تھا۔ اچّھا تلوار کا دھنی اور نشانے باز ہونا عام بات تھی۔ ہتھیار عام طور پر بندوق یا رائفل تلوار اور کنجل [1] ہوتے جو نسل درنسل باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتے چلے آتے۔ ہتھیاروں کے بعد ان کی سب سے محبُوب ملکیت ان کے گھوڑے ہوتے۔ انھیں ایک اچھا ہتھیار اور ایک اچھی نسل کا گھوڑا دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ مرغُوب تھا۔

چیچنیا کے باشندے اچھے مسلمان تھے۔ اگرچہ کہیں کہیں شرک و بدعات کے کچھ نشانات ابھی باقی تھے۔ بڑے بڑے دیہات میں مسجدیں موجُود تھیں جہاں عُلما قرآن پاک کا درس دیا کرتے تھے۔ عربی زبان داغستان اور تمام شمالی قفقاز میں نہ صرف دینی اہمیت کی حامل تھی بلکہ لکھنے پڑھنے کی زبان بھی یہی تھی۔

امام شاملؒ کی تحریک جہاد سے پہلے دیوانی اور فوجداری مُقدّمات مقامی زبان میں مقامی عادات یا رسُوم ورواج کے مطابق طے کیے جاتے تھے۔ چیچنیا کے رہنے والے دراز قد قوی الجثّہ اور خوش شکل لوگ تھے۔ ذہین بہادُر اور جرّی افراد پر مشتمل ان لوگوں میں عزّت کے لیے لڑنے مرنے کا جذبہ موجود تھا۔ مہمان نوازی ان پر ختم تھی اور وہی لوگ جو کسی راہ چلتے مُسافر کو گولی مار

---

[1] کنجل خنجر سے بڑا ہوتا ہے۔ یہ داغستانیوں کا عام ہتھیار تھا۔ جس طرح صوبہ سرحد میں عام طور پر پٹھان ہر وقت رائفل اپنے ہمراہ رکھتے ہیں، اسی طرح داغستانی کنجل کو کسی وقت جدا نہیں کرتے۔

دینے سے دریغ نہیں کرتے تھے اگر اسی مُسافر کو اپنے گھر میں داخل ہوتا دیکھ لیتے تو اس کے لیے دیدہ ودل فرشِ راہ کرتے اور اپنی جان تک قربان کر دینے کے لیے تیار ہو جاتے۔ رُوسیوں کے خلاف جہاد کی خاصی اہمیت تھی اور عورتیں بھی صرف اسی شخص کو قابل توجہ سمجھتی تھیں جس نے رُوسیوں کے خلاف کوئی اہم کارنامہ سرانجام دیا ہو۔ مردوں کے لیے کرنے کا کام جہاد ہی سمجھا جاتا تھا۔ گھریلو کام عورتیں کرتی تھیں یا وہ غلام جو زیادہ تر جنگی قیدی ہُوا کرتے تھے۔

**باب دوم:**

# تحریکِ جہاد کا آغاز

## تحریک مریدیّت:

امام شامل تحریک جہاد کے بانی نہ تھے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ وہ قفقاز میں ایک ایسے سلسلے سے وابستہ تھے جسے عرف عام میں مریدیت کا نام دیا گیا ہے۔ طریقت کے اعتبار سے یہ سلسلہ نقشبندیہ [1] سے منسلک تھے۔ یہ محض خانقاہی تصوّف کا سلسلہ نہ تھا بلکہ اس نے جہاد و اصلاح کے عظیم کارنامے سرانجام دیے۔ داغستان میں اس سلسلے کی ابتدا مُلّا محمّدؒ نے کی جو یاراغل کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے اس کی رہنمائی اپنے ہاتھوں میں لینے کی بجائے قاضی مُلّا کے سپُرد کر دی جو غمری کے رہنے والے تھے۔ ان کے بعد ہمزاد بیگؒ اور امام شاملؒ اس تحریک کے رہنما رہے۔

## رُوسیوں کے مظالم:

امام شاملؒ کی تحریک جہاد چونکہ رُوسیوں کے ظُلم وتشدُّد کے خلاف تھی اس لیے رُوسیوں کے مظالم اور اس علاقے میں ان کے اقدامات کے بارے میں مختصر معلومات ضروری ہوں گی۔ رُوس نے ملکہ این کے زمانے میں داغستان سے ہاتھ اُٹھا لیے تھے۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے اس کا داغستان پر قبضہ تھا۔ ۱۷۷۶ء میں شمال مشرقی داغستان کے حکمران تارکو نے اپنی

---

[1] حضرت خواکہ محمد بہاؤالدین بخاری رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۱۷ء۔۱۳۸۹ء) اس سلسلے کے بانی تھے۔ نقشبندی کے معنی مصور کے ہیں۔ چونکہ آپ نے تصوف کو اس کے اصل رُوپ میں پیش کیا اس لیے آپ کے مرید اس سلسلے کو نقشبندیہ کے نام سے پکارنے لگے۔ یہ سلسلہ وسط ایشیا کے علاوہ افغانستان، ترکی، ایران، پاکستان اور ہندوستان میں بہت مقبول ہے۔ یوں تو تصوف کے تمام سلسلے سنت نبوی کے پیروی پر خاصا زور دیتے ہیں لیکن نقشبندی مسلک میں سنت کی پیروی اور عمل کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔

رضا مندی سے شہنشاہت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اس کے بعد مختولی نے بھی اس کے تتبع میں ایسا ہی کیا ۱۷۹۶ء میں ذوبوف کی سرکردگی میں روسی افواج نے جب ایران پر چڑھائی کی تو ایک بار پھر کیسپین کے ساحل پر قبضہ کر لیا اور داغستان کے چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کے باہمی تنازعات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس ملک کے خاصے بڑے علاقے پر تسلط جما لیا۔ اس وقت توپ خانہ کوہستانی لوگوں کے لیے نئی بات تھی یہی وجہ تھی کہ توپ کا ایک آدھ گولہ بڑے سے بڑے لشکر کو بھگا دینے کے لیے کافی تھا۔ مختلف خوانین اور چھوٹے حکمرانوں کو روس کی وفاداری کا حلف اٹھانے کے لیے آمادہ کیا جاتا اور جب عوام کچھ عرصے کے بعد آزادی کا نعرہ لگاتے تو ان پر بغاوت کا الزام لگایا جاتا۔ ان کے خلاف روسی افواج چڑھ دوڑتیں اور ان کے گھر بار شہر اور گاؤں اجاڑ دیے جاتے۔

۱۷۹۶ء میں دربند پر قبضہ کے موقع پر تباسران نے بھی اطاعت قبول کر لی اور ۱۸۰۳ء میں داغستان کے سب سے اہم علاقے آدے ریانے اور ۱۸۰۶ء میں باکو اور کوبہ کے علاقے بھی روس کی سرحدوں میں شامل کر لیے گئے۔ ۱۸۱۳ء میں عہد نامہ گلستان کے ذریعے ایران نے نہ صرف ان علاقوں پر بلکہ دربند، کورین، طاش، شیخین، شیروان اور قراباغ کے علاقوں پر بھی روس کی بالادستی تسلیم کر لی۔ ۱۸۲۰ء میں قاضی قومخ کے خان نے اپنے علاقوں میں آزادی کا علم بلند کیا لیکن اس کے دارالحکومت پر قبضہ کر لیا گیا اور اس کے علاقے کورین میں شامل کر لیے گئے۔ آخر کار ۱۸۲۴ء میں کوروبو کے علاقے (بشمول غمری) کے رہنے والوں نے اپنے کئی سربرآوردہ لوگ روس کو وفاداری کے ثبوت میں بطور یرغمال دیے۔ اس طرح تقریباً چوتھائی صدی کے عرصے میں داغستان کا خاصا بڑا حصہ اور اس کے جنوب میں واقع صوبے بھی روس کے قبضے میں آ گئے۔ ان تمام مقبوضات کو ہتھیانے کی داستان قریب قریب وہی ہے جو انگریزوں کے ہندوستان میں قدم جمانے کی ہے۔ دھوکہ، فریب، ظلم و تشدد اور ہر جائز و ناجائز ذریعے سے تہذیب کے نام پر مقامی آبادی سے ہر طرح کا سلوک روا رکھا گیا، یہ کہا گیا کہ روس مہذب ملک ہے جب کہ ان پہاڑوں میں رہنے والے وحشی ہیں۔ لیکن وحشی پن اور

بربریت کے میدان میں روس کہیں زیادہ سبقت لے گیا زار روس کے مظالم کی داستانیں یوں تو بہت مشہور ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ قفقاز کے مسلمانوں سے جس ظلم و تشدد کا سلوک روا رکھا گیا وہ انتہائی شرمناک ہے۔ کسانوں سے جبری بیگار اور جبری بھرتی لی جاتی تھی پھر ایک ایسا نظام قائم کیا گیا جس کے تحت کاسک قبائل زراعت اور دفاع دونوں فرائض سرانجام دیتے تھے۔ یہ نظام داغستان میں بھی رائج کیا گیا۔ اگرچہ داغستان کے اندرونی علاقوں میں یہ نظام رائج نہ ہوسکتا تھا لیکن داغستان کی سرحدوں پر کاسک قبائل کو زرخیز زمینوں پر بسایا گیا اور ان کے ذمّے اس علاقے کا دفاع بھی کیا گیا۔ تلوار کے ساتھ ساتھ ہل اور زرعی آلات بھی استعمال میں آتے گئے۔ اس طرح روس نے داغستانیوں کے خلاف حصار کو مضبوط تر کر دیا۔

یہی وہ حالات تھے کہ امام شامل ؒ کی تحریک اٹھی۔ ایک کافر حکومت مُسلمان عوام پر تشدّد کر رہی تھی۔ اس طرح عوام میں ایک رُوحانی انقلاب ان کی زندگیوں میں سیاسی انقلاب کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوسکتا تھا۔ وہ اپنے نظریات اور اپنے دین پر اسی صُورت میں عمل کر سکتے تھے کہ آزاد ہوتے۔ غلامی ایک ایسی صُورت حال ہے جسے اسلام اور اس پر ایمان لانے والے کسی طرح بھی قبول نہیں کر سکتے۔ اس کے ساتھ ساتھ رُوس کی شہ پر مقامی خوانین اور سردار عوام پر ظلم کیا کرتے۔ ظالموں کو رُوس کی مکمل حمایت اور آشیرباد حاصل ہوتی۔ دُوسری طرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقوں اور اللہ کے احکام میں اس صُورت حال کی کوئی گنجائش موجود نہ تھی۔ اسلام میں تمام افراد کو مکمل آزادی دی گئی ہے اور مساوات کا اصُول قائم کیا گیا ہے۔

## جہاد کی تیاّری

ان حالات میں مریدیت کی تحریک جہاد کے لیے سربکف ہوگئی اور مُلّا محمدؒ نے مسلمان عوام کو غیور [1] یعنی غیر قوم کے افراد کے خلاف اُبھارا۔ اب تک تصوّف اور خانقاہ کا نظام چل رہا تھا لیکن یہ سب کچھ اسی وقت تک تھا جب تک ماسکو کے حکمرانوں نے ان کی سرزمین کی

[1] لفظ ''غیور'' کی حیثیت بھی وہی ہے جو ''فرنگی'' کی تھی اور فرنگی کی طرح یہ لفظ بھی گالی کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

طرف اپنی نظریں نہیں لگائی تھیں اور جعل و فریب کے ذریعے ان کی زمینوں کو قبضے میں نہیں لے لیا تھا۔ لیکن اب جب کہ یہ تشویشناک صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی یہ ضروری تھا کہ خانقاہوں میں اللہ ہُو کی صداؤں کے ساتھ ساتھ تلواریں تیز کرنے کی آوازیں بھی سنائی دیں اور مریدین جہاد کی تیاریوں میں مشغول ہو جائیں۔

گلے میں غلامی کا طوق ڈال کر مالک حقیقی کی عبادت کے فرائض صحیح طور پر ادا نہیں کیے جا سکتے تھے۔ اسلام غلاموں کے لیے نہیں اُترا تھا۔ یہ تو اس بندۂ حُر کا دین تھا جو طاغوت کی غلامی کا انکار کر دے اور ضرورت پیش آنے پر اپنی آزادی کی حفاظت تلوار سے کرے۔ تلوار کی تیز دھار سے زیادہ داغستانیوں کو اور کوئی چیز محبوب نہ تھی۔ سیاسی آزادی کے بغیر دینی احکام بے حقیقت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ علامہ اقبال نے بجا طور پر کہا تھا ؎

شکوہ عید سے مُنکر نہیں ہوں میں لیکن
قبولِ حق ہیں فقط مرد حُر کی تکبیریں

وقت آن پہنچا تھا کہ غلامی کی زنجیروں کو توڑا جائے اور یہی ہُوا ؎

می رسد مردے کہ زنجیر غُلاماں بشکند

## پہلے امام:

قاضی مُلاؒ ۱۷۹۳ء میں غمری میں پیدا ہُوئے۔ انھوں نے کونائی کے مقام پر عربی سیکھی اور اراکنی میں سعید آفندی سے دینی تعلیم حاصل کی۔ وہ انتہائی سنجیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شُعلہ بیان مُقرر بھی تھے۔ امام شاملؒ نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ وہ پتّھر کی مانند خاموش تھے۔ ایک رُوسی مُصنّف لکھتا ہے کہ "وہ لوگوں کے دل میں آگ بھڑکا دیتے تھے"۔ ان کا ایک ایک لفظ عوام کی رُوح میں ارتعاش پیدا کر دیتا تھا۔ انھوں نے اپنے علم و فضل کی وجہ سے عوام کے دلوں میں گھر کر لیا تھا اور ان کی عزّت و تکریم رچی بسی تھی۔ وہ انتہائی دلیر اور ارادے کے پکے تھے۔ اپنے مقصد کی راہ میں انھیں اپنی جان کی قطعاً پروانہ تھی۔

## امام شاملؒ کی جسمانی تربیت:

امام شاملؒ قاضی مُلا کے بچپن کے ساتھی تھے۔ ایک ہی گاؤں میں رہنے والے ان دو افراد نے غمری کے نام کو روشن کیا۔ امام شاملؒ کا نام بچپن میں علی رکھا گیا۔ لیکن وہ ابتدائی چھ سال کے دوران بیمار رہے اس لیے مقامی بڑے بوڑھوں کے کہنے پر ان کا نام شامل رکھ دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت سے ان کی صحت بہتر ہوتی گئی اور ان میں غیر معمولی قوّت پیدا ہوگئی۔ انھوں نے اپنی صحت بہتر بنانے کی پُوری کوشش کی اور دوڑنے، چھلانگیں لگانے، نیزہ بازی اور دُوسری ورزشوں میں وہ کمال حاصل کیا کہ ۲۰ سال کی عمر میں پُورے داغستان میں ان کا کوئی ہم پلہ نہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ۲۷ فٹ چوڑی خندق بڑی آسانی سے عبور کر سکتے تھے اور عام قد کے دو افراد کے سر کے اُوپر رستّے سے چھلانگ لگا سکتے تھے۔ غمری کے محاصرے میں انھوں نے رُوسیوں کے سر کے اُوپر سے چھلانگ لگا کر ان پر عقب سے حملہ کیا تھا اور پھر زخمی ہونے پر ایک اور جست لگا کر جنگل میں غائب ہو گئے تھے۔

وہ ننگے پاؤں اور کُھلے سینے ہر موسم میں گھومتے رہتے، اس طرح انھوں نے داغستانیوں جیسے سخت جان جفاکش لوگوں میں بھی اپنی بہادری اور جفاکشی کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا تھا۔ وہ انتہائی تیز فہم محنتی، علم کی طلب اور جُستجو رکھنے والے انسان تھے ان میں رہنمائی کی تمام تر صلاحیتیں موجود تھیں۔ وہ کسی حد تک حساس بھی واقع ہوئے تھے اور قوم اور ملک کی حالت پر کُڑھتے رہتے تھے۔ ایک حساس ذہن ہی ایسے حالات میں ایک عظیم تحریک کی قیادت کر سکتا تھا۔

## شراب نوشی کے خلاف جہاد:

امام شاملؒ کے پہلے اُستاد اُن کے اپنے ساتھی قاضی مُلاؒ تھے۔ وہ بعد میں اکثر کہا کرتے کہ انھوں نے قاضی مُلاؒ سے جتنا علم حاصل کیا وہ کسی اور استاد سے نہیں کیا۔ انھوں نے داغستان کے اکثر علما سے اکتسابِ علم کیا اور آخر کار وہ یاراغل پہنچے۔ یاراغل میں وہ مریدیت کی تحریک میں شامل ہو گئے اور سب سے پہلے انھوں نے جس بُرائی کے خلاف جہاد شروع کیا وہ

شراب نوشی تھی۔ یہ جہاد بہت کامیاب رہا۔ غمری کے لوگوں نے قاضی مُلاّ کے جبے کو بوسے دیے اور کئی لوگوں نے اپنے آپ کو اس بُرائی میں مُلوث ہونے کی وجہ سے پیٹا۔

## تحریک کا پھیلاؤ:

اسی دوران جب کہ رُوسی سنگینوں کا دائرہ ہر طرف سے تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ قاضی مُلاّؒ کے اثر و رسوخ میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا۔ جنگل کی پھیلی ہُوئی آگ کی طرح ان کی تحریک لوگوں میں مقبول ہوتی جا رہی تھی۔ رُوس کی مادّی فتوحات اور قاضی ملاّؒ کی اخلاقی فتوحات بیک وقت داغستان میں مُوجود تھیں اور اس وقت جب کہ زارِ رُوس کے سپاہی حُریّت اور آزادی کی آخری چنگاری تک کو اپنے تئیں پاؤں تلے روند چکے تھے۔، یہ شعلے بھڑک اٹھنے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ وہ وقت قریب تھا جب کہ داغستان کی دور دراز سرحدوں تک یہ آگ پھیلنے والی تھی۔

اس سے پہلے یاراغل کی حیثیت ایک ایسی جگہ کی تھی جہاں لوگ اطمینانِ قلب تلاش کرنے یا تصوّف کی اعلیٰ منازل طے کرنے کے لیے آتے تھے۔ لیکن کچھ ہی عرصے میں یہاں چند مجاہدانہ انداز لیے ہوئے چہرے نظر آنے لگے۔ وہ جب یہاں سے جاتے تو ان کے دل ایک نئے ولولے اور ایک نئے جذبے سے سرشار ہوتے۔ ملاّ محمدؒ ۱۸۲۲ء یا ۱۸۲۳ء میں حاجی اسماعیل کی طرف سے مرُشد مقرّر ہوئے اور اسی وقت سے انھوں نے یاراغل کی مسجد میں دعوت و ارشاد کا کام شروع کر دیا تھا۔ لیکن ان کے جہاد کے نظریات کو مکمل طور پر سامنے آنے میں کچھ دیر لگے گی۔ ۱۸۲۷ء میں غمری میں قاضی ملاّ نے کھلے عام تبلیغ کا کام شروع کر دیا اور ساتھ ہی جمال الدینؒ سے طریقت اور تزکیۂ نفس کے لیے رہنمائی حاصل کرنا شروع کر دی۔ جمال الدینؒ نے پہلے پہل جہاد کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا اور قاضی ملاّ کو مسلح جدوجہد شروع کرنے سے منع کیا (گو بعد میں وہ اس تحریک کے سرگرم معاون بن گئے) [1]

---

[1] جمال الدینؒ نے اپنی بیٹی زیدت امام شاملؒ کے عقد میں دی تھی اور وہ ان کے بہترین دوست اور مشفق ناصح کی حیثیت رکھتے تھے۔

قاضی ملاؒ نے ایک بار پھر یاراغل کا سفر اختیار کیا اور ملا محمد سے کہا' اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے کہ منکروں اور کافروں سے جہاد کرو اور جمال الدینؒ اس کی اجازت نہیں دیتے۔ آپ خود بتائیں کہ میں کس کی بات مانوں؟ جواب ظاہر تھا۔ ملا محمد نے کہا کہ ہمیں انسانوں کی بجائے اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرنی چاہیے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب جہاد کا آغاز ہوا۔ جونہی قاضی ملاؒ اپنے آبائی گاؤں میں واپس پہنچے انھوں نے شریعت کے نفاذ کی تحریک شروع کر دی جس کا واضح مقصد خلافِ اسلام عادات، رسوم و رواج اور بدعات کو ختم کرنا تھا۔ [1] ساتھ ہی انھوں نے تمام مسلمانوں کی سیاسی و معاشرتی برابری کا نعرہ لگایا اور مسلمانوں کو بتایا کہ سوائے ان لوگوں کے جو دینی اعتبار سے بہتر ہوں اور جن پر عوام کا اعتماد ہو کسی دوسرے کی وفاداری اور اطاعت لازم نہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ روس کی وفاداری اور اطاعت نہ فرض ہے اور نہ پسندیدہ۔ اگرچہ وقتی طور پر ایسے مواقع پر جبکہ مزاحمت بالکل بے سود نظر آئے، مصالحت کی جا سکتی ہے تاہم یہ پسندیدہ صورتِ حال نہیں۔

شروع شروع میں انھوں نے واضح طور پر جہاد کی تبلیغ نہیں کہ کیونکہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔ قاضی ملاؒ نہ صرف بہت اچھے خطیب تھے بلکہ وہ ایک اچھے عالم دین بھی تھے۔ انھیں چار سو کے قریب احادیث زبانی یاد تھیں اور وہ مناسب موقع پر ان کے استعمال سے اپنے مخالفین کو قائل کر لیا کرتے تھے۔ وقتی طور پر انھوں نے خلافِ اسلام رسوم و رواج اور عادات کے خلاف جہاد کیا تو جلد ہی ان کی شہرت اس حد تک پھیل گئی کہ تارکو کے شامخال میں (جو زارِ روس

---

[1] برصغیر میں انیسویں صدی کے نصفِ اوّل میں سید احمد شہیدؒ نے بھی اپنی تحریک جہاد شروع کرنے سے پہلے تمام تر توجہ ان غلط رسوم و رواج کی طرف مبذول کی جنھوں نے اسلام کے ضابطۂ زندگی کو نگاہوں سے اوجھل کر رکھا تھا۔ انھوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ یہ غلط رسوم جو مقامی اور قدیم روایات کی وجہ سے رائج تھیں، ختم ہو جائیں اور حضور اکرم ﷺ کی سُنت معاشرے میں دوبارہ جاری ہو جائے۔ کیا عجب کہ امامؒ کو سیدؒ صاحب کی تحریک کا علم ہو۔ اگرچہ اس بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ یہ قرآن حکیم کی بنیادی دعوت کا کرشمہ ہے۔ کہ ؎

یک چراغیست دریں بزم کہ از پرتو آں
ہر کجامی نگری انجمنے ساختہ اند

کا وفادار باج گزار تھا اور اسے روس کی فوج میں میجر جنرل کا عہدہ بھی حاصل تھا۔) قاضی ملّا کو اپنے دارالحکومت میں بلا کر حاز نیشچی کی مسجد میں تبلیغ کے لیے بلوالیا بلکہ انھیں اریلی کے مقام پر قاضی مقرر کر دیا۔ قاضی قوموخ کے ارسلان خان نے بھی جس کی روس کے حق میں وفاداری مشتبہ تھی۔ قاضی موصوف کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور ان کی شہرت داغستان میں دور دور تک پھیل گئی۔ جوں جوں ان کے پیروکاروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، وہ اپنے طریق کار میں مناسب تبدیلی کرتے گئے۔ اس سے پہلے ان کی تبلیغ و دعوت کا زیادہ تر زور شریعت کے نفاذ اور مقامی رسوم اور بدعات کو ختم کرنے پر تھا۔ اب انھوں نے جہاد کی دعوت بھی دینی شروع کر دی۔ ۱۸۲۹ء میں انھوں نے غمری کے مقام پر اپنے مریدین کو واضح طور پر بتا دیا کہ جہاد کا وقت آن پہنچا ہے۔ اور وہ اس مقصد کے لیے تیار ہو جائیں اس دوران روسی حکومت ایران اور ترکی کے ساتھ جنگوں میں مشغول تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس ابھرتے ہوئے انقلاب کی طرف اپنی توجہ مرکوز نہ کر سکی۔

داغستان کے معاشرتی حالات:

ممکن ہے قاضی ملّا کی دعوت اور طریق کار کے بارے میں یہ سوال پیدا ہو کہ انھوں نے ابتدا ہی سے جہاد کی دعوت کیوں نہ دی اس سے پہلے انھوں نے بدعات اور عادات کی اصلاح کیوں ضروری سمجھی؟ اس سوال کے جواب کے لیے ضروری ہے کہ داغستان کے معاشرتی حالات کا جائزہ لیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ داغستان کے رہنے والے سب کے سب مسلمان تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں جاہلیت کے رسوم و رواج رچے بسے ہوئے تھے۔ ان کی مُعاشرت کا نقشہ ۱۸۲۰ء کی برِعظیم پاک و ہند کی شمال مغربی سرحد سے کسی حد تک ملتا جُلتا تھا، جب کہ سیّد احمد شہید نے یہاں اپنی دعوت کا آغاز کیا تھا۔ جیسے یہاں قبیلے تو قبیلے، خاندانوں اور گھروں کی دشمنیوں نے ان میں اتحاد نام کی کوئی چیز باقی نہ رہنے دی تھی اور خُون کا بدلہ خُون کے نظریے نے صدیوں تک قتل و غارت کو روا رکھا ہوا تھا، اسی طرح اس دور میں داغستان کا حال تھا۔ داغستان مختلف قبیلوں، نسلوں اور لسانی گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔ یہ قبیلے اور نسلیں ایک

دُوسرے کی جانی دشمن تھیں۔ گاؤں گاؤں محلے محلے، گھر گھر ایک دوسرے کی دشمنیاں صدیوں سے چلی آ رہی تھیں۔ یہ قتل وخون اصل میں خوں بہا کے ایک مفصّل نظام کی وجہ سے اور بھی بڑھ گیا تھا اور مقامی عادات اس پر سخت اصرار کرتی تھیں۔ اس ضمن میں یوں تو سیکڑوں مثالیں دی جاسکتی ہیں لیکن میں یہاں دو یا تین مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

قبائلی جھگڑے:

امام شاملؒ نے یہ واقعہ خود بیان کیا ہے کہ تین سو سال قبل کادار گاؤں کے ایک دہقان نے اپنے ہمسائے کی مرغی چُرالی جس نے اس کا بدلہ یوں لیا کہ بھیڑ اُٹھالی۔ پہلے نے اس کے بدلے میں دو بھیڑیں چُرائیں تو دوسرا اس کے بدلے میں گائے کھول کر لے گیا۔ اب پہلے چور نے ہمسائے کا گھوڑا چُرالیا جس پر ہمسائے کو اتنا غصّہ آیا کہ اس نے اس عظیم نقصان کا بدلہ چُکانے کے لیے اسے جان سے مار ڈالا اور بھاگ گیا۔ خُون کا بدلہ خُون ہونا چاہیے تھا لیکن قاتل فرار ہو چکا تھا۔ اس لیے مقتول کے رشتہ داروں نے مقامی عادات کے مُطابق قاتل کے قریب ترین عزیز کو قتل کر دیا۔ اب تو قتل کا سلسلہ باقاعدہ شروع ہو گیا اور تین صدیوں تک برابر چلتا رہا۔ اس عرصے میں عزّت کے نام نہاد تصّور اور مقامی عادات کے مُطابق سیکڑوں بے گناہ افراد موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ یہ سب کچھ ایک مرغی کی وجہ سے ہُوا۔

اسی طرح آندی کے ایک گاؤں میں تقریباً ۲۰۰ سال پہلے چرواہے نشانہ بازی کی مشق کر رہے تھے کہ ایک شخص کو گولی لگی اور وہ مرگیا۔ اب یہ واقعہ اتفاقاً پیش آیا کسی نے جان بوجھ کر گولی ماری، اس بارے میں کچھ علم نہیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اس کے بعد قتل و غارت کا وہ بازار گرم ہُوا جس میں بوڑھے اور عورتیں تک شریک ہوگئیں۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اس پوری آبادی میں سے صرف چار آدمی زندہ بچ سکے۔

اسی طرح ۱۸۲۶ء میں ایک گاؤں میں کسی شخص کے گھر لڑائی شروع ہوگئی جس کی وجہ ایک ایسا قتل تھا جس کا بدلہ پہلے ہی لیا جاچکا تھا۔ اس لڑائی میں گھر میں موجود چودہ افراد میں سے صرف ایک شخص بچ سکا تھا۔ تفصیلات کے اعتبار سے یہ اور اس طرح کے دُوسرے واقعات

چاہے مختلف ہوں لیکن ان سب میں بنیادی عوامل وہی ہیں۔ یہ غلط قسم کے رواج اور عادات چاہے مختلف قبیلوں میں مختلف ہوں لیکن ان کی بُنیاد ایک ہی ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ تمام عادات اسلام کے اصولوں سے مُتصادم ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان قبائل نے اگرچہ اسلام قبول کر لیا تھا تاہم جاہلیت کے رسُوم و رواج کو مکمل طور پر نہیں چھوڑا تھا جو نہی اسلام کی گرفت ان پر ڈھیلی ہُوئی ان پُرانے رسوم اور عادات نے پھر سر اُٹھا لیا اور یہ قبائل اسلام سے قبل جاہلی نظام پر پھر عمل کرنے لگے۔ اسلام کی تعلیمات اس سلسلے میں بڑی واضح ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ان پر عمل کرنے کے باوجود ایسی صورتِ حال پیش آئے۔

شریعت کا نفاذ:

امام شاملؒ نے شریعت الٰہی کا نفاذ عملی طور پر پورے داغستان میں کیا۔ انھوں نے اسلامی اُصولوں کے مطابق ہر اس شخص کو سزا دی جس نے قاتل کے علاوہ کسی اور پر ہاتھ اٹھایا ہو۔ اس طرح صُورت حال خاصی حد تک بہتر ہو گئی تھی۔ انھوں نے لوگوں کو خون بہا معاف کرنے کی ترغیب بھی دی کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ بات ہے۔ لیکن یہ عادات اس قدر راسخ ہو چکی تھیں کہ امام شاملؒ کے اس دور کو چھوڑ کر جسے دورِ شریعت کہا جاتا ہے ان کا دوبارہ معاشرے میں عمل دخل ہو گیا داغستان کے اس علاقے میں جہاں امام شاملؒ کے اثرات زیادہ مضبوط تھے ابھی تک شریعت کے احکام کے اثرات باقی ہیں۔ وہاں اب بھی صلح صفائی کی کوشش کی جاتی ہے اور خُون بہا پر بھی معاملہ طے ہو جاتا ہے۔ مکۃ المکرّمہ [1] سے واپس آتے ہوئے حاجیوں کی وجہ سے بھی خوشگوار اثرات مرتّب ہوتے ہیں اور اب وہاں خونریزی کے واقعات خاصی حد تک کم ہوتے جا رہے ہیں۔ امام شاملؒ کے مریدین کی تعداد زیادہ سے زیادہ ایک سو بتّیس رہی ہے۔ ان کی حیثیت امام شاملؒ اور ان کے نائبین کے باڈی گارڈز کی تھی لیکن اس قلیل تعداد کے باوجُود امام شاملؒ داغستان کے پورے علاقے کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ امامؒ کے گرد و پیش جو مریدین اور نائبین جمع

---

[1] روس کی حکومت نے اب کافی عرصے سے حج کے فریضے کی ادائیگی پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔

تھے وہ اپنے علم اور عمل کی قوتوں کے اعتبار سے اپنے گرد و پیش کے افراد پر بڑی حد تک فوقیت رکھتے تھے اور ان کی حیثیت مقامی رہنماؤں کی سی تھی۔ یہ مرکزی گروہ جسے امامؒ نے اپنے گرد اکٹھا کیا تھا پورے داغستان میں جہاد کی رُوح پھُونک دینے کے لیے کافی تھا۔ اس کی حیثیت ایک ہراول دستے کی سی تھی جس کے جلو میں داغستان اور چیچنیا کے بہادر فرزند سر بکف پیش قدمی کر رہے تھے۔ اس صورت حال کو موجودہ دور میں گوریلا جنگ کے ماہر چی گویرا نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"گوریلا جنگ لڑنے والا گروہ ایک ایسا مرکز ہوتا ہے جس کے گرد و پیش لڑنے والے عوام ہوتے ہیں۔"

## تحریک جہاد:

قاضی ملاّ کی مختصر لیکن ہنگامہ پرور زندگی کئی نُمایاں کامیابیوں اور نمایاں ناکامیوں سمیت ایک ایسا دور تھا جو اُن کی شکست اور شہادت پر ختم ہُوا۔ لیکن وہ آنے والے دنوں کے لیے ایسی سُلگتی چنگاریاں چھوڑ گیا جو ایک بار پھر شعلۂ جوالہ بنیں اور انھوں نے زارِ رُوس کی افواج کو بھسم کر کے رکھ دیا۔ قاضی ملاّ کو کئی اہم قسم کی کامیابیاں نصیب ہُوئیں اور انھیں زندگی میں متعدد ناکامیوں کا منہ بھی دیکھنا پڑا۔ وہ کئی بار موت کے منہ میں جاتے جاتے بچے لیکن اپنی تمام زندگی میں ایک لمحے کے لیے بھی انھوں نے اپنے مقصد حیات کو فراموش نہیں کیا۔ غمری کے اعلانِ جہاد سے لے کر اُن کی شہادت تک ہمیں ان کی زندگی میں ایک دن بھی ایسا نہیں ملتا جس میں انھوں نے ہمت ہار دی ہو یا شکست کی وجہ سے نا اُمید ہو کر بیٹھ گئے ہوں۔ داغستان کے مسلم عوام کے نام انھوں نے پہلی بار ۱۸۲۹ء میں اعلان جہاد تحریر کیا۔ غمری میں ایک عام اجلاس میں جس میں داغستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہُوئے علماء بھی شریک تھے قاضی ملاّ کو امام بنایا گیا اور سب لوگوں نے ان کے اعلان جہاد کی حمایت کی۔

## آور پر لشکر کشی:

سب سے پہلے آور کے صُوبے پر لشکر کشی کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ خاصا اہم علاقہ تھا۔ اس وقت

یہاں کا خان نابالغ تھا اور حکومت اس کی ماں پا خوبیگی کے ہاتھوں میں تھی۔ یہ عورت غیر معمولی ذہانت اور شجاعت کی مالک تھی۔ ۴ فروری ۱۸۳۰ء کو تقریباً تین ہزار مجاہدین سمیت قاضی ملّا آندی پہنچے جہاں ان کے ہمراہ اتنے ہی مزید افراد شامل ہو گئے۔ راستے میں انھیں کئی جگہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور ایک جگہ مسلّح مزاحمت میں انھوں نے ستائیس افراد ہلاک کر دیے اور خاصی تعداد میں زخمی بھی کیے۔ تقریباً ساٹھ افراد یرغمال کے طور پر غمری اور اونتوکول کے قید خانوں میں بھجوا دیے گئے۔ اس سے قاضی ملّا کے جذبۂ جہاد کی شدّت پر روشنی پڑتی ہے۔ غمری سے چلتے وقت انھوں نے جہاد کا علم بلند نہیں کیا تھا۔ وہ پیدل چلتے رہے اور انھوں نے گھوڑے پر سوار ہونا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ راستے میں وہ کئی بار رُک کر کچھ سُننے کی کوشش کرتے۔ جب لوگوں نے پوچھا تو انھوں نے کہا مجھے یوں لگتا ہے کہ رُوسی سپاہی میرے ساتھ زنجیروں میں بندھے ہُوئے لائے جا رہے ہیں اور مجھے ان کی زنجیروں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔'

انھیں جہاد کے شروع ہونے سے پہلے ہی اپنے مقصد کی کامیابی کا اس قدر یقین تھا کہ وہ کئی بار پتّھر پر بیٹھ کر اسلام کی کامیابی اور اس کی اشاعت کے منصوبے تیار کرتے۔ وہ جہاد کی کامیابیوں کے بارے میں اس حد تک یقین سے سرشار تھے کہ وہ کہتے 'جب ہم غیور قوم کو قفقاز سے نکال باہر کریں گے اور ماسکو پر قبضہ کر چکے ہوں گے تو ہم استنبول جائیں گے اور اگر سلطان نیک شخص ہُوا اور شریعت کے احکام کا عامل ہوا تو ہم اس سے تعرّض نہیں کریں گے بصُورت دیگر ہم اسے زنجیروں سے باندھ دیں گے اور اس کی سلطنت مومنین کے سُپرد کر دی جائے گی۔''

جب وہ آندی کے قریب پہنچے تو آندی کے مسلمانوں نے باہر نکل کر اپنے کپڑے اور چادریں رستے میں بچھا دیں۔ وہ حقیقت میں اپنے دیدہ و دِل فرشِ راہ کرنا چاہتے تھے۔ آندی کے عوام میں ان کی مقبولیّت کے اس مظاہرے سے گرد و پیش کے کافی لوگ متاثر ہُوئے۔ آور میں خاصی تعداد میں لوگوں نے امام کا ساتھ دیا۔ البتہ خونزاخ میں جہاں سات سو گھر تھے، صُورت حال مختلف تھی۔ پا خوبیگی نے کافی حد تک مضبوط دفاعی انتظامات کر رکھے تھے اور عوام

نے پاخوبیگی کا ساتھ دینے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ ۱۴ فروری ۱۸۳۰ء کو مریدین دو حصوں میں بٹ گئے۔ ان کی قیادت قاضی ملاّ اور امام شاملؒ کر رہے تھے۔ تکبیر کے نعروں کے ساتھ انھوں نے حملے کا آغاز کیا۔ خونزاخ کے لوگوں نے آج تک اتنی پُر رعب اور گرجدار آواز نہیں سُنی تھی۔ مریدین نعرۂ تکبیر اور کلمۂ طیبہ پڑھ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ان نعروں نے خونزاخ کے لوگوں پر اس درجہ ہیبت طاری کر دی کہ ان کے ہتھیار گر پڑے اور فائرنگ کا سلسلہ اچانک بند ہو گیا۔

اس موقع پر پاخوبیگی فوراً ان کے سامنے آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ اس کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے شُعلے نکل رہے تھے۔ اس نے آور کے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ اگر تم خوف زدہ ہو گئے ہو تو یہ ہتھیار ہم عورتوں کے سپرد کر دو اور ہمارے چوغوں کے پیچھے پناہ لے لو۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ ہتھیار اُٹھا سکو۔ پاخوبیگی کے اس طعنے نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ مدافعین کو فتح ہُوئی اور مریدین کو بھاری شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس جنگ میں مریدین میں سے دو سو افراد شہید اور بے شمار زخمی ہُوئے۔ ساٹھ قیدی بنا لیے گئے۔ امام شاملؒ بھی قریب تھا کہ شہید ہو جاتے لیکن ایک درویش نے انھیں بچا لیا۔

امام شاملؒ اس کے بعد بھی کئی بار معجزانہ طریقے سے بچتے رہے اور یہ غالباً پہلا واقعہ تھا۔ کوہستانیوں نے اسے بھی امام شاملؒ کی روحانی طاقت کا کرشمہ سمجھا۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ اپنی پُوری زندگی میں اتنی بار موت کے منہ سے بچتے رہے ہیں کہ وہ کسی کرامت سے کم نہیں۔ حاجی مرادؒ نے، جو اس واقعہ کے بعد خاصے مشہور ہوئے، اس موقع پر مریدین کے جنگی پرچم اور دوسرے ہتھیار اپنی اور آور کی وفاداری کی علامت کے طور پر طفلس بھجوا دیے۔ قاضی مُلاّ اس اچانک شکست پر غمری لوٹ گئے اور اُنھوں نے اس شکست کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ قرار دیا اور کہا کہ ہمیں اپنے اعمال کی درستی کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور اپنے ایمان کو مزید مضبوط بنانا چاہیے۔

رُوسیوں سے مقابلہ:

قاضی ملاّؒ کا منصوبہ یہ تھا کہ خونزاخ پر قبضے کے بعد آدخ پر حملہ کیا جائے اور رُوسیوں کے

قلعے ویزا پنایا کو تسخیر کیا جائے۔ رُوسی کمانڈر بیرن روزن اس حملے کے منصوبے کی اطلاع ملتے ہی ایک چھوٹی سی لیکن مضبوط فوج کے ہمراہ اس قلعے کی حفاظت کے لیے روانہ ہُو چکا تھا لیکن خونزاخ کے واقعات کی اطلاع ملنے پر وہ کوہ خراخ پہنچا جہاں غمری کے سوا کوسوبو کے تمام دیہات نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ قاضی ملاؒ نے رُوسیوں کے غمری پر حملہ نہ کرنے کا فائدہ اٹھاتے ہُوئے اپنے دل شکستہ ساتھیوں کو اُبھارا اور چند ہفتوں ہی میں ایک بہت بڑی تعداد ان کے ہمراہ چلنے کے لیے تیار ہوگئی۔

وہ اب اگاٹھ قلعہ پہنچے۔ رُوسی افواج نے میجر جنرل پرنس بیکووچ کی قیادت میں انھیں یہاں سے پیچھے دھکیلنے کی ناکام کوشش کی۔ یہاں سے قاضی ملاؒ اتلی بویوں کی طرف روانہ ہُوئے جہاں انھوں نے ایک اور کمانڈر بیرن ٹوبے کی افواج کو شکست دی اور پارول کو تباہ کر دیا جہاں اس علاقے کے سربراہ کا گھر تھا۔ رُوسی قلعہ بورنایا کی توپوں کے فائر کے باوجود انھوں نے تارکوف پر قبضہ کر لیا اور قلعہ فتح کرنے والے ہی تھے کہ رُوسی کمک آ پہنچی اور انھیں بھاری نقصانات اُٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔ اب انھوں نے خومقشند میں پناہ لی۔ یہ واقعہ مئی ۱۸۳۱ء [1] کے اواخر کا ہے۔

دس دن کے بعد مجاہدین نے ویزا پنایا کی طرف پیش قدمی کی اور اس قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ جنرل ایمونئیل کی سرکردگی میں روسی فوج اس قلعے کو بچانے کے لیے پہنچی۔ قاضی ملاؒ نے بورنایا کے تجربات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس بار مزاحمت کی بجائے قریبی جنگل میں پناہ لی۔ یہاں انھوں نے دشمن کو بُری طرح شکست دی۔ ایک توپ ان کے قبضے میں آ گئی اور جنرل ایمونئیل زخمی ہوگیا۔ اس نے کمان جنرل ولمینوف کے سپرد کر دی۔

امام ہمزاتؒ کی کوششیں:

دوسری طرف امام ہمزادؒ (جو بعد میں دوسرے امام بنے) نے جارو بیلوکانیز کے علاقے

---

[1] عجیب اتفاق ہے کہ انہی دنوں سرحد میں معرکہ بالاکوٹ پیش آیا جس میں سید احمد شہیدؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، اور ان کے ساتھیوں کو سکھوں کے ہاتھوں شہادت نصیب ہوئی۔

میں رُوسیوں کے خلاف علم آزادی بلند کیا۔ روسی افواج جنرل سیٹر کالوف کی قیادت میں تحریک آزادی کو کُچلنے کے لیے آئیں لیکن انھیں بھاری شکست اٹھانی پڑی۔ ذکاتلی کے مقام پر چھ رُوسی افسر اور دوسو تینتالیس (۲۴۳) سپاہی ہلاک ہوئے۔ دس روسی افسر اور ایک سو اُنتالیس (۱۳۹) سپاہی زخمی ہُوئے جب کہ کل فوج صرف تین پلٹنوں پر مشتمل تھی۔ چار توپیں مجاہدین کے ہاتھ لگیں۔ شہنشاہ نکولائی کو اس خبر سے بہت صدمہ ہُوا کہ اریوان کی دونوں پلٹنیں اس موقع پر بھاگ گئیں۔

قاضی ملاؒ ایک بار پھر خومشقند واپس چلے گئے جہاں تباسران کے علاقے کے لوگوں کا ایک وفد ان سے ملنے آیا، جس نے انھیں دعوت دی کہ وہ تباسران آ کر رُوسیوں کے خلاف جہاد شروع کریں۔ قاضی ملاؒ بغیر کسی توقف کے دربند روانہ ہو گئے جہاں انھوں نے آٹھ دن تک اس قلعے کا محاصرہ کیے رکھا۔ یہاں انھیں اپنے مقصد میں کوئی خاص کامیابی نہ ہو سکی، اس لیے انھوں نے محاصرہ اٹھالیا اور کزلیر [1] کے شہر پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ یہاں سے قاضی ملاؒ دوسو قیدی اور تقریباً چار لاکھ روبل کا مال غنیمت لے کر داغستان واپس پہنچے۔

رُوسیوں کے نقصانات:

یکم دسمبر ۱۸۳۱ء کو جنرل کاخالوف نے خومقشند کے مضبوط دفاعی حصار کو ختم کرنے کے لیے کرنل مکلاشووسکی کو بھیجا۔ کرنل نے حملہ کیا لیکن مزاحمت اس قدر شدید تھی کہ ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق چار سو رُوسی مارے گئے۔ ان میں کرنل مکلاشووسکی اور آٹھ دوسرے افسر بھی تھے۔ یہ حملہ روسی افواج کو کافی مہنگا پڑا۔ جنرل ایمنوئیل کی فوج سے جو توپ چھینی گئی تھی اسے واپس لینے کے لیے تقریباً اسّی روسی سپاہیوں نے جانیں دیں۔ اس جنگ میں ڈیڑھ سو مریدین شہید ہوئے اور ان کا ایک شخص بھی قیدی نہیں بنایا جا سکا۔

۱۸۳۲ء میں قاضی مُلاؒ چیچنیا کے علاقے میں پھر نمودار ہُوئے اور نزران کا محاصرہ کر

---

[1] کہا جاتا ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں امام شاملؒ اور قاضی ملا اس شہر میں تعلیم حاصل کرنے آئے تھے، اس لیے وہ یہاں کے حدود اربعہ سے پوری طرح واقف تھے۔ ان کی پیشگی معلومات نے اس حملے کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔

لیا۔اس علاقے میں انہیں کئی جگہ کامیابیاں نصیب ہوئیں۔لیکن نزران کے محاصرے کے دوران دوبار حملوں کے باوجود کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔چنانچہ وہ محاصرہ اُٹھا کر پسپا ہو گئے۔

## چیچنیا کی مہم:

قاضی ملاؒ نے اب قفقاز کو ایک متحدہ مسلم قوت بنانے کے لیے داغستانیوں کی ایک فوج چیچنیا کے علاقے میں بھیجی تاکہ انھیں اسلام کی دعوت دی جائے۔یہ مہم خاصی کامیاب رہی اور کافر قبائل کافی تعداد میں مسلمان ہو گئے۔یہ نومسلم جو تازہ تازہ ایمان لانے کی وجہ سے شدید جذبات رکھتے تھے،اپنے جذبۂ اسلام کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے بے چین تھے۔انھوں نے قریبی علاقے میں رُوسی پولیس کے افسر اور کچھ پادریوں کو قتل کر دیا۔یہ اطلاع رُوسی حکومت کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی تھی۔چنانچہ فوراً ہی بیرن روزن کی قیادت میں ایک مہم روانہ کی گئی۔جنرل ولیمنوف اس کے چیف آف سٹاف تھے۔

گالگیز قبیلے کے لوگ تعداد میں بہت کم تھے اور اتنے بے مایہ تھے کہ شاید ہی اس فوج کا مقابلہ کر سکتے۔لیکن انھوں نے اطاعت قبول کرنے کی ہر درخواست کو بے اعتنائی سے ٹھکرا دیا اور مقابلے کی ٹھان لی۔انھوں نے ان لوگوں کو حوالے کرنے سے بھی انکار کر دیا جو رُوسی پولیس کے افسر اور پادریوں کے قتل کے مرتکب ہوئے تھے۔قفقاز سے چودہ میل پر رُوسیوں نے ایک کالم کی تشکیل کی جس میں تین ہزار سپاہی، چار پہاڑی توپیں اور پانچ سولیشیا کے جوان شامل تھے۔اس علاقے میں سڑکیں موجود نہ تھیں اور افواج اپنے ہمراہ کسی قسم کے خیمے نہ لے جا سکتی تھیں۔ہر شخص ہتھیاروں کے علاوہ بسکٹوں کا ایک تھیلا لیے ہوئے تھا جو چھ دن کے لیے کافی تھا۔دُوسرے دن کے سفر کے بعد افسران کے خیمے بھی پیچھے چھوڑ دیے گئے۔صرف کمانڈر انچیف، چیف آف سٹاف اور چانسلری کے خیمے ہی آگے لے جائے جا سکے۔چوتھے میل پر راستہ اور زیادہ تنگ ہو گیا اور پوری فوج کو ایک قطار میں چلنا پڑا۔توپیں کئی جگہ خچروں پر پہنچانی پڑیں۔یہ کالم تقریباً پانچ میل لمبا ہو گیا تھا۔

پانچویں دن پہلی بار کچھ گولیاں چلنے کی آواز آئی لیکن کسی جگہ بھی رُوسیوں کو مزاحمت کا

سامنا نہیں کرنا پڑا۔ انھوں نے گاؤں کے گاؤں تباہ کر دیے اور فصلیں کاٹ لیں۔ مقامی افراد اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ کھلے میدان میں ممکن نہیں۔ چنانچہ وہ پیچھے رہ جانے والے اِکاّ دُکاّ سپاہیوں کو نشانہ بناتے رہے اور حملہ آور فوج پر ان مناسب جگہوں سے جن کی اس راہ میں کمی نہ تھی، پتھر اور چٹانیں لُڑھکاتے رہے۔ اس مہم کا مقصد توری قصبے کو تباہ کرنا تھا اور تمام فوج اس طرف روانہ ہو گئی لیکن راستہ اس قدر تنگ تھا کہ اگر ایک سپاہی بھی رُک جاتا تو تمام فوج اس کے پیچھے رُکنے پر مجبور ہو جاتی۔

**ایک عجیب واقعہ:**

راستے میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ہُوا یہ کہ توری سے کچھ فاصلے پر ایک بلند بُرج پڑتا تھا۔ اس بُرج میں مقیم افراد نے فوج کو تین دن تک روکے رکھا۔ بالآخر چوتھے دن ایک سمت چٹان کو توڑ کر سوراخ بنایا گیا اور بارودی سرنگ بچھائی گئی تا کہ برج کو تباہ کیا جا سکے۔ جب اس برج کے محصورین نے ہتھیار ڈال دیے تو روسی افواج کے جوان حیران رہ گئے کہ پھٹے پُرانے کپڑوں میں صرف دو مجاہدوں نے چار ہزار سپاہیوں پر مشتمل رُوسی فوج کو تین روز روکے رکھا۔ یاد رہے کہ یہ وہ واقعہ ہے جو رُوسی چیف آف سٹاف نے بعد میں خود بیان کیا۔ اس لیے اس کی صداقت میں کسی قسم کا شُبہ نہیں کیا جا سکتا۔

## باب سوم:

# رُوسی مُہمات

گالگیز کی مہم کے کچھ عرصے بعد روزن اور ولیمنوف نزران سے نو ہزار جوانوں اور اٹھائیس توپوں کے ہمراہ چیچنیا کے زیریں علاقے کو پوری طرح مُسخّر کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ ایک روسی افسر اس مہم کا حال ان الفاظ میں بیان کرتا ہے: اس میں شک نہیں کہ ۱۸۲۰ء کے لگ بھگ جنرل یرملوف نے گوئٹن جنگل کے درمیان سے ایک سڑک نکالی تھی اور سڑک کے دونوں طرف کافی راستہ صاف کر لیا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ راستہ بھی جنگلی پودوں اور درختوں سے اٹ چکا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ہمیں چیچنیا کی مہم کے دوران میں جگہ جگہ خاصے مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ چیچنیا کے لوگوں کو دشمنی کے باوجود ہمیں تعریف کے الفاظ سے یاد کرنا پڑتا ہے۔ وہ بڑے بہادر دشمن تھے۔ ان کا کوئی مخالف بھی ان کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ فوجی چالوں اور جنگی ہنرمندی میں ان کا جواب نہ تھا۔ وہ بہت اچھے نشانہ باز اور انتہا درجے کے بہادر تھے اور قفقاز کے دوسرے باشندوں کی طرح مقامی حالات کا فائدہ اُٹھاتے تھے۔ وہ ہماری معمولی سی غلطی سے فائدہ اٹھا کر ہمیں بھاری جانی نقصان پہنچانا جانتے تھے اور وہ بھی اس بلا کی تیز رفتاری کے ساتھ کہ ہم تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

چیچنیا کے لوگوں کے ساتھ جنگ کا ہر دن مصروف گزرتا تھا۔ مگر بہت کم ایسا ہوتا کہ کسی بڑے گروہ کے ساتھ لڑائی کا موقع ملتا یا کسی دفاعی قصبے پر حملے یا چھاپے کا پروگرام بنتا۔ سڑک گھنے جنگل میں سے گزرتی تھی۔ کہیں کہیں ندیاں عبور کرنا پڑتی تھیں۔ ہر روز سفر کے دوران گولیوں کی بوچھاڑ کا سامنا کرنا پڑتا۔ ہمارے آدمی ہلاک ہوتے لیکن دشمن کا کوئی شخص نظر نہ آتا۔ جنگل میں دُور کہیں کہیں دُھواں نظر آتا تو ہمارے سپاہی اندازے سے نشانہ لگاتے۔

''ہم سفر کے دوران چند دن قیام کرتے۔ اس کا انحصار قریبی علاقے میں مورچہ بند

گاؤں اور قصبوں کی تعداد پر ہوتا۔ چھوٹے چھوٹے دستے فصلوں میں آگ لگاتے اور دشمن کی رہائش گاہوں کو تباہ کرنے کے لیے بھیجے جاتے۔ قصبوں کو آگ لگتی اور فصلیں تباہ ہوتیں۔ گولیوں کی آوازیں فضا میں گونجتیں اور زخمی یا مردہ سپاہی واپس لائے جاتے۔ ہمارے تاتاری سپاہی (مقامی افراد) کئی کٹے ہوئے سر لے کر کیمپوں میں واپس آتے لیکن کوئی بھی قیدی نہ پکڑا جا سکا۔ یہ لوگ کبھی امان حاصل کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ ان کے بچے اور عورتیں پہلے ہی ایسی جگہوں پر چھپے ہوتے جہاں انھیں ڈھونڈنا امر محال تھا۔ ایک دستہ شب خون مار کر جنگل سے واپس آ رہا تھا کہ اس کے پچھلے حصے پر دشمن نے حملہ کر دیا۔ وہ بڑی مشکل سے جان بچا کر واپس آ رہا ہے۔ ہر طرف سے گولیوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ تلواریں سونتے ہوئے مقامی افراد اس دستے کو تہس نہس کر رہے ہیں اور صرف اُس وقت واپس ہوتے ہیں جب کیمپ سے ایک بٹالین توپوں کے ہمراہ فائر کرتی ہوئی جنگل کی طرف دوڑتی ہے۔ اور یہ ڈرامہ ہر بار دُہرایا جاتا ہے۔''

ہمارے سپاہی گھاس کاٹنے کے لیے جاتے ہیں اور پھر لڑائی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ گھاس یا لکڑی سے صرف ہتھیاروں ہی کی مدد سے لائی جا سکتی ہے۔ اگر پانی کی جگہ کے قریب ہی کوئی جنگل ہے تو تقریباً نصف بٹالین اور توپیں پانی لانے والوں کی مدد کے لیے موجود ہونی چاہئیں۔ ورنہ دشمن گھوڑوں کو یا تو مار ڈالیں گے یا انھیں کھول کر لے جائیں گے۔ ہر دن پچھلے دن کی طرح گذرتا ہے۔ ہر طرف پہاڑ ہیں، جنگل ہیں یا چیچنیا کے بہادر لڑاکے ہیں جن کی زد سے بچ نکلنا خاصا مشکل کام ہے۔

''مارچ کے دوران ہم اپنی طرف سے مکمل حفاظتی انتظامات کرتے چلتے۔ ایک بٹالین آگے ہوتی، ایک پیچھے اور دونوں کے ساتھ ہلکا توپ خانہ بھی ہوتا۔ اگر سڑکیں مناسب ہوتیں تو پہاڑی توپیں بھی ان کے ہمراہ ہوتیں۔ رسالہ، محفوظ دستے، توپ خانہ اور رسد کا سامان درمیان میں ہوتا اور اس کے ساتھ پیادہ دستے

دائیں بائیں موجود ہوتے۔ فوج کے ہر حصے کے ساتھ عُمدہ نشانہ باز افراد ہوتے۔ مارچ کے دوران فوج کے دونوں اطراف سے فائرنگ ہوتی رہتی اور فوج کا کمزور حصہ اس کا خاص طور پر نشانہ بنتا۔ نشانہ باز عام طور پر دو دو کی تعداد میں ہوتے۔ بعد میں ویلمنوف نے ان کی تعداد میں اضافہ کر کے چار اور جنرل فرئیک نے بیس اور بسا اوقات اس سے بھی زیادہ بڑھا دی تھی۔ جنگل میں اکثر وہ ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے۔ یہی وہ موقع ہوتا جب کہ چیچنیا والے عقابوں کی طرح جھپٹ کر انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے اور جب ان کے ساتھی مدد کو پہنچتے تو اس وقت تک یہ لوگ غائب ہو چکے ہوتے۔''

مختلف گروہوں کو ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرنے کے لیے مختلف سگنل نمبر دیے گئے تھے۔ یا پھر ہارن کے ذریعے رابطہ قائم کیا جاتا۔ رسل و رسائل کے اس نظام کو اکثر بدل دیا جاتا تاکہ دشمن اس سے آگاہ نہ ہو سکے۔ کئی بار ایسا ہوتا کہ دشمن کی گولیوں کی بوچھاڑ لشکر کے عین درمیان میں ہوتی لیکن ایسا بہت کم ہُوا کہ وہ خود لشکر پر آن پڑے ہوں۔ اکثر ان کی لڑائی لشکر کے گرد و پیش حفاظتی دستوں کے دو افراد سے ہی ہوتی۔ پُورے مارچ کے دوران صرف چار ایسے مواقع تھے جب کہ دشمن کو اصل لشکر سے مقابلہ درپیش ہُوا۔

کیمپ لگاتے وقت ہم اپنی طرف سے پورے حفاظتی انتظامات کرتے۔ رات کو مختلف جگہوں پر خفیہ مورچے بناتے اور تمام رات مکمل خاموشی رہتی تاکہ دشمن کو کسی طرح پتہ نہ چل سکے۔ لیکن اس کے باوجود شاید ہی کوئی رات ایسی گزری ہو کہ چیچنیا کے لوگ ان حفاظتی انتظامات کے باوجود کیمپ تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوئے ہوں تقریباً ہر رات ہماری گولیوں سے تواضع کی جاتی۔

۱۸/اگست کو قاضی مُلاؒ کو روسیوں کے خلاف آخری کامیابی حاصل ہوئی۔ امیر جاچی یورت کے قریب وہ پانچ سو کے قریب کاسک فوجیوں کے گروہ کو جنگل میں تقریباً ۲۰ میل اندر تک اپنے پیچھے لے آنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب مجاہدین ہر طرف سے رُوسیوں پر ٹوٹ

پڑے اور انھیں مکمل طور پر شکست دی۔ رُوسی کمانڈر کرنل وولزلسکی اور ایک اور افسر مع ۴۰ اسپاہیوں کے مارے گئے اور ۲ افسر اور ۴۲ دوسرے سپاہی زخمی ہُوئے۔

اس واقعے کے چھ دن بعد ویلمنوف نے غور منچوگ پر حملہ کیا۔ یہ چیچنیا میں سب سے بڑا اور خوش حال قصبہ تھا۔ اس میں تقریباً ۶۰۰ گھر تھے۔ قاضی ملاؒ نے اپنے مریدین کو اس قصبے کے دفاع کے لیے بھیجا۔ لیکن گاؤں میدانی علاقے میں واقع تھا اور رُوسی توپ خانے کے لیے ان کے پاس توپیں نہ تھیں نتیجہ صاف ظاہر تھا لیکن گاؤں کے لوگ اور مریدین جنھیں قاضی مُلاؒ نے بھیجا تھا، بڑی بے جگری سے مقابلہ کرتے رہے۔ گاؤں کے ایک سرے پر تین گھر تھے جن میں چیچنیا کے لوگوں کا ایک گروہ اور داغستانی مرید جمع تھے۔ اس کے بعد کیا ہُوا؟ آیئے جنرل تورنوف سے یہ کہانی سُنیں۔

## جنرل تورنوف کی رپورٹ:

''ہمیں یہ اطلاع ملی کہ چیچنیا کے ان لوگوں نے جو ہتھیار ڈالنے سے انکار کر رہے ہیں، ایک لیفٹیننٹ کرنل اور دُوسرے کئی سپاہیوں کو مار ڈالا ہے اور شدید فائرنگ کر رہے ہیں۔ یہ اطلاع ملنے کے بعد وولخوسکی (جو چیف آف سٹاف تھا) کرنل برمز اور دو اعلیٰ افسر میرے ہمراہ اس صورت حال کے مُعائنے کے لیے روانہ ہُوئے۔ میں اس پارٹی کی رہنمائی کر رہا تھا۔ ہم نے معائنہ کیا تو معلوم ہُوا کہ مکانوں کے ہر طرف عُمدہ نشانہ باز موجود ہیں۔ ان کے سامنے آنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم ان کی گولی کا نشانہ بن جائیں۔ لہٰذا ہم نے یہیں رُکنا مناسب سمجھا اور صورت حال کے جائزے کے بعد فیصلہ کیا کہ ان مکانات کو آگ لگانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں یہ کام کرنا آسان نہ تھا لیکن بارُودی سرنگیں بچھانے والے دو افراد اس کے لیے تیار ہو گئے۔ انھوں نے رینگ رینگ کر مکانوں کی مٹی کو کھودا اور ان میں بارودی سرنگوں کے ذریعے شگاف کیے۔ اس کے بعد انھیں آگ لگا دی۔ اس کے باوجود اس وقت تک فائرنگ جاری رہی جب تک کہ آگ دیواروں کے اُوپر تک نہیں پہنچ گئی اور وہ لوگ شدید گرمی کی وجہ سے یہ جگہ چھوڑنے پر مجبُور نہیں ہو گئے۔ اب توپ خانے کے کچھ افراد بھی ان

کے ساتھ شامل ہو گئے اور انھوں نے ایک جلتے ہُوئے روشن دان میں سے کئی دستی بم اندر پھینک دیے۔ ان بموں کے فلیتے جل رہے تھے۔ اور اندر مکان میں مجاہدین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ دو ایک دھماکوں کی آوازیں آئیں لیکن باقی بم نہیں پھٹ سکے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ لوگ ان بموں کے اُوپر بیٹھ گئے اور جلتے ہوئے فیتوں کو بارود میں آگ لگنے سے پہلے بُجھا دیا۔"

اسی اثنا میں آگ پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ تین گھروں میں سے ایک گھر جل کر خاکستر ہو چکا تھا اور دو گھر باقی تھے۔ وولخوسکی کو ان بہادُر افراد پر ترس بھی آ رہا تھا کہ ناحق جان دے دیں گے۔ چنانچہ ایک ترجمان کو بلایا گیا اور اسے کہا گیا کہ اگر یہ لوگ ہتھیار ڈال دیں تو کمانڈر انچیف کی طرف سے نہ صرف ان کی جان کی سلامتی کی ضمانت دی جائے گی بلکہ انھیں رُوسی قیدیوں کے بدلے میں رہا بھی کر دیا جائے گا۔ جب ترجمان آگے بڑھا تو فائرنگ بند ہو گئی اور مذاکرات ہونے لگے کچھ دیر کے بعد ایک نیم برہنہ، افلاس زدہ، چیچنیا کا باشندہ آیا۔ اس نے مختصر سی تقریر کی اور ساتھ ہی تمام مورچوں سے گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ مُترجم کے بقول اس کی تقریر کا لُبِ لباب یہ تھا:

"ہمیں کسی قسم کی امان کی ضرورت نہیں۔ ہم پر صرف ایک احسان کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ روسی ہمارے خاندانوں کو بتا دیں کہ ہم نے جینے کے مُقابلے میں مر جانے کو پسند کیا اور ہم نے غیور کے تسلط کو آخر دم تک ماننے سے انکار کر دیا۔"

"اس پر ہر طرف سے مکانوں کو آگ لگا دینے کا حکم دے دیا گیا۔ چیچنیا کے لوگوں نے شہادت کے گیت بلند آواز سے گانا شروع کر دیے۔ آہستہ آہستہ ان گیتوں کی آواز مدھم ہوتی گئی۔ ایک جلتا ہُوا دروازہ کھُلتا، ایک شخص باہر آتا، بندوق سے گولی سر کرتا اور تلوار لہراتا ہُوا آگے بڑھتا۔ لیکن گولی کی زد میں آ کر وہیں لڑکھڑا کر گر پڑتا۔ کچھ دیر بعد ایک اور شخص باہر نکلتا اور یہی واقعہ دہرایا جاتا۔ دُوسرا آتا اور ہماری صفوں پر ٹوٹ پڑتا۔ جلتے ہوئے گھر ملبے کی صورت

اختیار کر رہے تھے۔ باغوں میں انگارے دہک رہے تھے۔ اچانک آگ اور دُھوئیں میں سے چھ افراد رینگتے ہوئے باہر نکلے۔ نہ معلوم وہ کس طرح ابھی تک زندہ تھے۔ سپاہیوں نے انھیں اٹھا کر ایمبولنس تک پہنچایا مگر انھوں نے وہیں دم توڑ دیا۔ ۷۲ لوگوں میں سے ایک بھی زندہ گرفتار نہ ہو سکا۔ تمام افراد شعلوں کی نذر ہو گئے۔ یہ لکھتے ہوئے میرا قلم لرز رہا ہے۔ میں نے اپنی پوری سروس کے دوران اتنے دلیر لوگ نہیں دیکھے اور شاید نہ کبھی دیکھنے نصیب ہوں۔ رات ڈھل رہی ہے مجھے اپنے دل کی جگہ ایک پتھر کا ٹکڑا رکھا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ کیا میری آنکھوں کو ایسے مناظر دیکھنے تھے! ۷۲ جیتے جاگتے افراد میری آنکھوں کے سامنے جل کر بھسم ہو گئے۔ اوہ خُدایا!۔''

یہ الفاظ لکھنے والے نے اپنے جذبات کا اظہار ضرور کیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ رُوسی فوجوں نے انتہائی شقاوت اور سنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چیچنیا کے ہرے بھرے باغات اور مکانوں کو ملبے اور راکھ میں تبدیل کر دیا۔ اس نفرت کے بیج جسے خون سے سیراب کیا گیا تھا بڑھے اور آج بھی اس کے آثار مقامی روایات میں موجود ہیں۔ اس مہم کے دوران میں ٦١ گاؤں مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیے گئے تھے۔ رُوسیوں کا ایک افسر اور ١٦ سپاہی مارے گئے۔ ١٨ افسر اور ٣٤٣ فوجی زخمی ہوئے۔

## غمری کا دفاع:

قاضی ملاؒ داغستان واپس پہنچے اور امام شاملؒ کی مدد سے غمری کے دفاعی انتظامات مکمل کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ انھیں معلوم تھا کہ آخری وقت آن پہنچا ہے اور وہ چاہتے تھے کہ ان کی شہادت رائیگاں نہ جائے۔ اکتوبر کے آخر میں رُوسی کمانڈر انچیف چیچنیا کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد داغستان میں داخل ہو چُکا تھا اور قاضی ملاؒ کے آخری مضبوط مورچے پر حملے کے لیے تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ موسم سرما کا آغاز اس بار کچھ جلد ہی ہو گیا تھا۔ بلندیوں پر کافی برف پڑ چکی تھی اور ابھی تک باغوں میں انگوروں کے خوشے اکٹھے کرنے کا کام

مکمل نہیں ہوا تھا۔ شورا سے غمری پہنچنے کے لیے دو راستے تھے لیکن دونوں راستوں میں ۵ ہزار فٹ کی اُترائی تھی۔ ان راستوں سے ایک بڑی فوج کا آنا خاصا دشوار تھا لیکن ویلمنوف نے کرنائی کے کم دُشوار گزار راستے سے پہنچنے کا فیصلہ کیا اور گہری دُھند کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پیش قدمی کرنے والے دستے کو دریا تک پہنچا دیا۔ اب سڑک بنانے کا کام شروع ہُوا تا کہ باقی ماندہ فوج بھی آسکے۔ چند دن بعد سڑک تیار ہونے پر پہاڑی توپ خانے اور مارٹر توپیں پہنچا دی گئیں۔ کلنگو ایک بٹالین، ایک پہاڑی توپ خانے کی بیٹری اور کچھ مقامی رسالے کے ساتھ پہنچ چکا تھا اور دوسری طرف سے احمد خان بھی مقامی ملیشیا کے ہمراہ ان کے ساتھ مل گیا۔ غرض ۱۷ نومبر تک حملے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔

دفاعی حصار:

قاضی ملاؒ اور امام شاملؒ کو حالیہ جنگوں کے تجربات سے یہ پتہ چل چکا تھا کہ صرف قدرتی دفاع پر انحصار کر لینا ہی کافی نہیں۔ انھوں نے غمری سے پانچ میل اُوپر دریا کی دوسری جانب دونوں راستوں کے جنکشن سے نیچے تین دفاعی حصار بنائے اور ان میں باقاعدہ مورچوں کا انتظام کر دیا۔ اس جگہ کا انتخاب بہت مناسب تھا۔۔۔۔۔قدرتی دفاع کے علاوہ خود ساختہ دفاعی انتظامات کی وجہ سے یہ پوزیشن خاصی مستحکم ہوگئی تھی۔ باہر کی دیوار کے قریب ہی پتھر کے دو مکان تھے۔ پہلے روسیوں نے ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی لیکن بعد میں لڑائی کے دوران اس جگہ نے خاصی اہمیت حاصل کر لی۔

ویلمنوف کا منصوبہ یہ تھا کہ مدافعین کو دیوار کے بائیں جانب سے دھکیل دیا جائے اور جب وہ دوسری طرف نکلیں تو ان پر سامنے کی جانب سے حملہ کر دیا جائے۔ لیکن یہ جنگی چال اس وجہ سے ناکام رہی کہ جس افسر کے ذمے یہ کام لگایا گیا تھا وہ اور اس کے ساتھی جنگل میں راستہ کھو بیٹھے اور دیوار کے سامنے ہی آ نکلے۔ انھوں نے براہِ راست حملے سے ان پر قبضے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش ناکام رہی۔ دُوسری رجمنٹیں بھی ان کی مدد کے لیے آگے بڑھیں لیکن اس حملے میں رُوسیوں کو بھاری جانی نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔ ہمزاد بیگ اپنے مریدوں کے ساتھ مدد

کے لیے پہنچے لیکن وہ بدقسمتی سے روسی فوج کے دو حصوں کے گھیرے میں آ گئے جس کی وجہ سے انھیں پسپا ہونا پڑا اور وہ قاضی ملاؒ کی مدد کے لیے نہ پہنچ سکے۔

ویلمنوف نے اس حملے کی ناکامی پر اصل منصوبے کے مُطابق دوبارہ حملے کے احکامات دیے اور اس بار نتائج بہتر رہے۔ دو دیواریں خالی کروالی گئیں، دو تین جگہ پر خوں ریز مقابلے ہُوئے اور بحیثیت مجموعی رُوسیوں کا پلّہ بھاری رہا۔ مُدافعین ایک ایسی جگہ پر بکھر گئے جہاں ان کے سامنے دو ہی صُورتیں باقی تھیں۔ یا تو وہ لڑتے رہتے یا پھر چٹانوں سے چھلانگ لگا کر ہلاک ہو جاتے۔ وہ بڑی بے جگری سے لڑے۔ تقریباً ۱۶۰ افراد نے اس موقع پر جام شہادت نوش کیا۔ باقی افراد چٹانوں پر سے کُود گئے۔ ان میں سے اکثریت یقیناً ہلاک ہوگئی ہوگی۔ دُوسری طرف رُوسیوں کی رجمنٹ کے کمانڈر اور خاصی تعداد میں روسی افواج کو بھی ہلاکت کا سامنا کرنا پڑا۔ بوگدونوچ (جو کہ رجمنٹ کا کمانڈر تھا) کی یادگار آج بھی شورا میں موجود ہے۔

دلیرانہ مُقابلہ:

اس سے پہلے دو گھروں کا ذکر آچکا ہے جو دیواروں کے ساتھ ہی تھے اور جن کی طرف رُوسیوں کی توجہ مبذول نہیں ہوئی تھی۔ یہاں بھی خونچونگ کی طرح شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور مریدین انتہائی بے جگری سے لڑے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ رُوسیوں کے جانی نقصانات اس موقع پر پہلے سے کہیں زیادہ تھے۔ اس جگہ تقریباً ۶۰ مریدین موجود تھے۔ ویلمنوف نے حکم دیا کہ ان گھروں کو مُدافعین سے خالی کروالیا جائے۔ اس پر دھاوا بول دیا گیا۔ مجاہدین ایک ایک دو دو کر کے باہر نکلتے اور رُوسی فوجیوں سے لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کرتے۔ ان میں سے ایک شخص نے بھی ہتھیار ڈالنے کی درخواست نہیں کی۔ اس بڑی تعداد میں سے صرف دو افراد زندہ نکلنے میں کامیاب ہو سکے۔ ان میں ایک امام شاملؒ تھے۔ وہ چیتے کی طرح لپکے اور دیکھتے دیکھتے تین رُوسی سپاہیوں کے سر کے اُوپر سے چھلانگ لگا کر انھیں پیچھے سے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اس اثنا میں چوتھے سپاہی نے ان کے سینے میں سنگین گھونپ دی۔ انھوں نے ایک ہاتھ سے سنگین کو پکڑا، اس کے مالک کو ہلاک کر کے سنگین سینے سے نکالی اور جنگل تک پہنچنے

میں کامیاب ہو گئے سنگین کے زخم کے علاوہ (جس کی وجہ سے ان کا پھیپھڑا شدید زخمی ہو گیا تھا) ان کے کاندھے کی ہڈی اور ایک پسلی بھی ٹوٹ گئی تھی۔

امام شاملؒ تین دن تک جنگل میں چھپنے کے بعد اونسوکول پہنچے جہاں وہ پچیس دن زندگی اور موت کی کشمکش میں مُبتلا رہے۔ ان کے سسر عبدالعزیز بھی کسی نہ کسی طرح یہاں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ ایک نامور جراح تھے۔ انھوں نے موم، مکھن اور کولتار کے مرکب سے مرہم تیار کر کے امامؒ کے زخموں پر لگایا جس سے زخم بھرنے لگے۔ اس اثنا میں امامؒ کی بہن فاطمہ بھی ان کی دیکھ بھال کے لیے آ گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ امامؒ دوبارہ بیمار ہو گئے اور کئی مہینے ان کی زندگی شدید خطرے سے دوچار رہی۔ داغستان میں یہ اعتقاد عام تھا کہ اگر مریض یا زخمی کے کمرے میں جواہرات یا زیور لایا جائے تو اس کا زخموں پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ فاطمہ غمری سے کچھ زیورات اور ہیرے وغیرہ اپنے ساتھ لائی تھیں۔ کہتے ہیں کہ انھی چیزوں کی وجہ سے امام شاملؒ دوبارہ بیمار ہُوئے۔ [1]

### قاضی مُلّاؒ کی شہادت:

غمری کی تباہی مکمل ہو چکی تھی۔ ہر طرف مریدین کی لاشوں کے ڈھیر لگے ہُوئے تھے۔ اکتوبر کی اس خون آشام سہ پہر میں کس کو امام شاملؒ کے بچ نکلنے کا خیال آتا، لیکن ایک عجیب انکشاف کی وجہ سے سب کی توجہ اس طرف مبذول ہو گئی۔ شہیدوں کی نعشوں کے ڈھیر میں رُوسیوں کو ایک عظیم الجثہ اور پُر رعب شخص کی لاش نظر آئی جو نماز کی حالت میں ایک ہاتھ سے اپنی داڑھی پکڑے ہوئے تھا اور دوسرا ہاتھ آسمان کی جانب اُٹھا ہوا تھا۔ جب مقامی افراد کو بُلایا

[1] داغستان کے باشندوں کا مطالعہ طب کے میدان میں چاہے واجبی اور ابتدائی نوعیت ہی کا ہو لیکن جہاں تک جراحت کا تعلق ہے وہ اس میدان میں مانے ہوئے تھے۔ وہ جسم کے اعضاء کا خواہ وہ کوئی جوڑ ہی کیوں نہ ہو خنجل کی مدد سے آپریشن کر لیا کرتے تھے اور عام طور پر اسی قسم کے مرہم سے جو عبدالعزیز نے تیار کیا تھا، زخم کو مندمل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ روسی افسر اپنے جراحوں کی طرف سے مایوسی پر انھیں بلوا بھیجتے اور اکثر اوقات وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو جاتے۔ کہتے ہیں کہ ان کا طریق کار جراثیم کش (ANTISEPTIC) ہوتا تھا اگرچہ انھیں جراثیم کے بارے میں کچھ زیادہ علم نہ تھا۔

گیا تو ان کے غم اور افسوس کی انتہا نہ رہی۔ انھوں نے بتایا کہ یہ لاش ان کے سپہ سالار قاضی ملاؒ کی ہے۔ یہ سُن کر رُوسیوں کی خوشی اور مسلمانوں کے رنج واندوہ کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ یہ خبر آگ کی طرح قرب وجوار میں پھیل گئی۔ مسلمانوں کی اکثریت اس بات کو ماننے پر آمادہ نہ ہوتی تھی کہ اللہ کی طرف سے جہاد پر مامُور اوران کا امام غیور کے ہاتھوں مارا جاسکتا ہے۔ رُوسیوں نے مقامی افراد کو اطاعت پر آمادہ کرنے کے لیے لاش اسی حالت میں رہنے دی اور اس کے بعد ضلع کے صدر مقام تارکو میں لے گئے جہاں پورنایا کے مقام پر انھوں نے لاش کو عزّت واحترام کے ساتھ دفن کر دیا۔ کچھ سال بعد امام شاملؒ نے رات کے وقت دوسو سوار بھیجے جو نعشِ مُبارک کو واپس غمری میں لے آئے۔

پچھلے روز کی شکست قاضی ملاؒ کی شہادت اور امام شاملؒ کی عدم موجودگی کی وجہ سے اگلے روز جب گلنگو غمری میں داخل ہُوا تو ایک گولی بھی نہ چلی۔ رُوسی غالباً یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ مریدیت کا خاتمہ ہو چکا ہے اور داغستان میں اب یہ تحریک ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہے۔

رُوسی افواج کے مقتولین اور زخمیوں کی تعداد ساڑھے چار سو سے زائد تھی۔ مریدین میں ۱۹۲ شہید ہُوئے۔ ان کے زخمیوں کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔

**ہمزاد بیگ کی شہادت:**

قاضی ملاؒ کی شہادت اور امام شاملؒ کے زخمی ہونے کی وجہ سے ہمزاد بیگؒ کو تحریکِ مریدیت کا سربراہ اور امام مُقرر کیا گیا۔ ان کے دور میں کوئی اہم مہم پیش نہیں آئی۔ کچھ شازشیوں نے جنھیں ہمزاد بیگؒ سے ذاتی دشمنی تھی، بلوہ کر کے انھیں مسجد میں اس وقت جب کہ وہ نماز پڑھانے کے لیے آ رہے تھے، شہید کر دیا۔ ان کی شہادت کے وقت امام شاملؒ خونزاخ سے خاصے فاصلے پر تھے لیکن یہ اطلاع ملتے ہی اُنھوں نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور اشیلتا پہنچے جہاں ان کی امامت کا اعلان کر دیا گیا۔

**باب چہارم:**

# امام شاملؒ کا دور

امام شاملؒ کے دور کا پہلا اہم واقعہ جنرل فیسی کی ۱۸۳۷ء کی مہم ہے۔ ۵۲۰۰ کی تعداد میں یہ فوج کے ہمراہ ۱۸۰ توپیں اور مارٹر توپیں تھیں، مئی کے آغاز میں تیمر خان شورا سے کا کا شورا کے راستے ہوتی ہوئی دریائے اروما کے کنارے پہنچی۔ ۲۷ میل کا یہ فاصلہ پانچ دن میں طے ہوا۔ مئی کے آخر میں یہ فوج خونزاخ پہنچی۔ راستے کی مشکلات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ ۱۰۰ میل کا یہ فاصلہ ۲۰ دنوں میں طے ہُوا۔ خونزاخ میں دفاعی انتظامات مکمل کیے گئے۔ یہاں چار کمپنیاں چھوڑ دی گئیں اور چھ توپوں کے سوا تمام توپ خانہ اور بھاری سامان یہیں چھوڑ کر دو ہفتے کا راشن ساتھ لے کر جنرل فیسی ۵ جون کو اونتو کول اور اشیلتا روانہ ہو گیا۔

اونتو کول کے لوگوں نے رُوسیوں کے آنے پر اطاعت قبول کر لی، انھیں یرغمال دیے اور ان کے تمام قیدی اور بھگوڑے واپس کرنے کا عہد کیا رُوسی افواج کے بھگوڑوں کی تعداد اچھی خاصی ہُوا کرتی تھی اس لیے تقریباً ہر جگہ شرائط میں سے ایک اہم شرط یہ بھی ہُوا کرتی تھی۔

۷ جون کی رات کو امام شاملؒ، تاشوف حاجی اور کبیت ماہو ما نے محاصرہ توڑنے کی غرض سے اچانک حملہ کیا اور اس کے بعد خون ریز جنگ شروع ہو گئی جس میں رُوسیوں کے دو افسر اور ۹۲ سپاہی ہلاک اور ۱۳ افسر اور ۱۸۳ آدمی زخمی ہو گئے۔ مریدین کے نقصانات بھی تقریباً اتنے ہی تھے۔ روسی تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ مریدین میں سے ۱۰۰ کے قریب شہید اور خاصی تعداد میں زخمی ہوئے تھے۔ رُوسیوں کے یہ نقصانات اس لحاظ سے خاصے تھے کہ اس وقت داغستان میں روسی افواج کی تعداد صرف ۵ ہزار تھی۔

**اشیلتا پر رُوسی حملہ:**

۹ جون کو جنرل فیسی انتو کول سے کچھ بلندی پر اپنی افواج کو لے آیا اور اشیلتا پر حملے کی

قیادت کی۔ مریدین کی فوج نے بٹیل کے بائیں کنارے پر ایک خاصی مضبوط پوزیشن لے رکھی تھی۔ دائیں طرف ایک بہت بڑی پہاڑی دیوار حائل تھی اور دوسری جانب خاصی گہرائی تھی۔ پہلی دفاعی لائن سے مریدین کو سنگینوں کے دباؤ تلے سے ہٹنا پڑا اور وہ آہستہ آہستہ گاؤں کی جانب پسپا ہوتے گئے۔ انھوں نے زمین کے ہر انچ کے لیے سخت مُقابلہ کیا۔ انگوروں کے خوشے ان کے خون سے تر بتر ہو رہے تھے۔ مختلف تختوں پر ان کا خون بہہ رہا تھا۔ تین گھنٹے کی مسلسل لڑائی کے بعد، جس میں رُوسیوں کو ہر باغ اور انگوروں کے ہر چمن میں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، روسی افواج اشیلتا کے بالمقابل پہنچ گئیں۔ یہاں دو ہزار مریدین نے آخری وقت تک مُقابلہ کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ انھوںؐ نے قُران پاک پر حلف لیا تھا کہ وہ آخر دم تک لڑتے رہیں گے۔

جنرل فیسی نے گاؤں پر حملے کے لیے ضروری تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ دو پہاڑی توپیں آگے لائی گئیں اور حملہ شروع ہو گیا۔ بایاں کالم گاؤں پہنچا جسے گولیوں کا سامنا کرنا پڑا صُورتِ حال خاصی نازک ہو رہی تھی کہ دایاں کالم گاؤں کی انتہائی دائیں جانب پہنچ گیا اور ایک ٹیلے پر مریدین کی محفوظ نفری کو دیکھ کر اس طرف متوجہ ہوا اور انھیں پسپا کرتا ہوا گاؤں کی گلیوں میں داخل ہو گیا۔ جنرل فیسی خود میدان میں آ گیا اور دست بدست جنگ شروع ہو گئی۔ اب لڑائی کمانڈروں کے ہاتھوں سے نکل چکی تھی۔ یہاں ذاتی شجاعت اور حوصلہ مندی کا امتحان تھا۔ مریدین دیوانہ وار رُوسیوں کی صفوں پر جھپٹتے اور سنگینوں کی زد پر شہید ہو رہے تھے۔ گھروں میں خون بہہ رہا تھا۔ نہ کہیں امان طلب کی گئی اور نہ کوئی قیدی بنایا جا سکا۔ جنرل فیسی خود میدان میں اُتر پڑا تھا۔ آخر کار دوپہر کے قریب اشیلتا پر رُوسی قبضہ ہو گیا اور اسے آگ لگا دی گئی پھر بھی کئی گھروں میں شام تک قتل و غارت ہوتی رہی۔ گھروں سے نکلے ہوئے یہ لوگ پہاڑی پر جمع ہو گئے تھے اور علما کے حوصلہ دلانے پر بار بار رُوسی صفوں پر جھپٹتے رہے مگر ان کی تمام کوششیں رایگاں گئیں۔ آخر کار تخات کے پُل کو عبور کر کے انھوں نے پُل کو آگ لگا دی۔

یہ عجیب بات ہے کہ اس درجہ شدید جنگ کے باوجود مقتولین کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی۔

رُوسیوں کے دس افسر اور ۷۰ اسپاہی ہلاک یا زخمی ہُوئے۔ مریدین کی ۸۷ لاشیں گنی جاسکیں۔ باقی آگ اور راکھ میں دب چکی ہوں گی۔ شہیدوں اور زخمیوں کی خاصی تعداد مرُیدین اٹھا کر لے گئے اور ایک بھی قیدی نہ بنایا جاسکا۔

اشیلتا کے ہرے بھرے باغات کو جلتا ہوا چھوڑ کر جنرل فیسی آگے بڑھا۔ وہ غرغبیل پر پوزیشن لینا چاہتا تھا کہ مریدین کی ایک بڑی فوج نے، جس کی تعداد بارہ ہزار بتائی جاتی ہے، اسے آن لیا۔ کئی بار حملے ہوئے اور ان کی شدت اتنی تھی کہ جب بارش کی وجہ سے بندوقیں بیکار ہوگئیں تو مخالفین نے پتھر استعمال کرنا شروع کر دیے۔ رُوسی فوج کی مزید کمک پہنچنے پر مریدین اگالی کی طرف پیچھے ہٹے اور جنگل میں غائب ہو گئے۔ رُوسیوں کو خاصا نقصان اُٹھانا پڑا۔ ایک افسر اور ۳۲ سپاہی مارے گئے۔ ۶ افسر اور ۱۲۸ سپاہی زخمی ہوئے۔

تلیتی پر رُوسی حملہ:

جنرل فیسی اونسوخول کی طرف پیچھے ہٹا اور وہاں سے رسد حاصل کرنے کے بعد تلیتی پہنچا جہاں روسی افواج نے امام شاملؒ کو روک رکھا تھا۔ تلیتی اشیلتا سے بھی بڑا گاؤں تھا۔ یہاں ۶۰۰ گھر تھے اور اس کے دفاعی انتظامات بھی خاصے بہتر تھے۔ یہاں ۹ بُرج تعمیر کیے گئے تھے۔ چند ہی دنوں میں روسیوں کے توپ خانے کی گولہ باری سے یہ تمام بُرج گر گئے اور سُلگتے ہوئے ان کھنڈروں کو حاصل کرنے کے لیے دھاوا بولنے والی فوج کو ایک افسر اور ۲۷ فوجیوں کی قربانی دینا پڑی۔ اس کے علاوہ ایک افسر اور ۴۹ فوجی مجروح ہوئے۔ چونکہ امام شاملؒ کے گرد و پیش مزید لوگوں کے جمع ہونے کی اطلاعات مل رہی تھیں اس لیے جنرل فیسی نے ۵ جولائی کو عام حملے کا حکم دے دیا۔ اشیلتا کے ''تمام مُہذب کارنامے'' یہاں بھی دُہرائے گئے۔ لیکن اب رُوسی نقصانات اس حد تک بڑھ چکے تھے کہ رُوسیوں کو صلح کے ذریعے اپنی جان بچانا زیادہ مناسب نظر آیا۔ صرف چار دن کی لڑائی میں روسیوں کے ۴ افسر اور ۶۰ سپاہی ہلاک اور ۱۳ افسر اور ۲۰۳ سپاہی زخمی ہُوئے تھے۔ دو دن تک مذاکرات ہوتے رہے۔ امام شاملؒ نے جنرل فیسی کو ایک خط تحریر کیا جس کی عبارت خاصی درشت تھی۔ جب اس کی ترشی کو کم کرنے کے لیے کہا گیا

تو دوسرے خط میں بھی الفاظ کی تبدیلی کے باوجود لہجہ ویسا ہی تُند تھا۔ جنرل فیسی کو یہ خط لیتے ہی بنی کیونکہ عظیم نقصانات کی وجہ سے اس کی حالت پتلی ہو رہی تھی اور وہ کسی طرح اپنی جان چھڑانا چاہتا تھا۔ ان خطوط سے امام شاملؒ کی حیثیت اور زیادہ مستحکم ہوگئی۔

## امام شاملؒ کے خطُوط:

۱۔ ''امام شاملؒ، تاشوف حاجی، کبیت ماہو کا راضی کے عبدالرحمٰن، محمد عمر اوگلی اور داغستان کے دُوسرے علما اور معززین کی جانب سے محمد مرزا خان کو یرغمال دے کر ہم رُوسی شہنشاہ سے صلح کا معاہدہ کر رہے ہیں جسے ہم میں سے کوئی بھی نہیں توڑے گا۔ شرط یہ ہے کہ کوئی فریق دوسرے کو معمولی سا نقصان بھی نہیں پہنچائے گا۔ کسی فریق نے اپنا وعدہ توڑا تو اسے وعدہ شکنی کا مرتکب سمجھا جائے گا اور وعدہ شکن لوگ اللہ اور اس کی مخلوق کے سامنے ملعُون قرار دیے جاتے ہیں۔ ہمارے اس خط سے ہمارے ارادوں کے درست ہونے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔''

۲۔ ''یہ خط روسی شہنشاہ اور شامل کے درمیان معاہدۂ امن کی وضاحت کرتا ہے۔ اس معاہدۂ امن کے ساتھ محمد مرزا خان یرغمال میں دیے جا رہے ہیں۔ شامل کی طرف سے اس کا چچا زاد بھائی جو اس کے بھتیجے کی آمد تک رہے گا۔ کبیت ماہو ما کی طرف سے اس کا چچا زاد بھائی اور کا راضی کے عبدالرحمٰن کی طرف سے اس کا بیٹا ہوگا تا کہ یہ معاہدۂ امن دیرپا ہو، شرط یہ ہے کہ کوئی فریق کسی قسم کی زیادتی یا بدعہدی کا مرتکب نہ ہوگا۔ کیونکہ بدعہدی کرنے والے اللہ اور اس کی مخلوق کے نزدیک ذلیل اور ملعُون ہیں۔''

## رُوسی نقصانات:

جنرل فیسی نے ان خطوط کے ملنے پر تلیتی سے اس وقت پسپائی اختیار کی جب کہ یہ آدھا گاؤں اُس کے قبضے میں تھا اور اس بات سے اس کی خستہ حالی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے مقرر کردہ راستے سے واپس لوٹا۔ حالت یہ تھی کہ ۴ سٹاف افسر، ۲۶ دُوسرے افسر جن میں ۱۴ کمپنی کمانڈر بھی شامل تھے اور ایک ہزار جوان زخمی ہو چکے تھے یا مارے جا چکے

تھے۔ آدھے گھوڑے مارے گئے تھے اور باقی ماندہ کا حال یہ تھا کہ وہ بمشکل چل سکتے تھے۔ ۱۰ پہاڑی توپوں میں سے ۵ بے کار ہوگئی تھیں۔ ٹرانسپورٹ نام کو باقی نہ تھی۔ فوجیوں کے کپڑے اور بُوٹ پھٹ چکے تھے اور وہ چیتھڑے لٹکائے پھر رہے تھے۔ گولہ بارود بھی ختم ہو چکا تھا۔

اس کے باوجود سینٹ پیٹرز برگ میں بیٹھے ہُوئے حکمرانوں کے سامنے جنرل فیسی نے اپنے قلم کے زور سے ایسی عُمدہ تصویر پیش کی کہ وہ جنرل فیسی کو مافوق الفطرت انسان سمجھنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کے خیال میں تحریک مریدیت ختم ہو چکی تھی اور پُورے داغستان میں رُوسی تسلُّط مکمل ہو چکا تھا۔ جنرل کلنگو کو اس وقت ان حقائق کا سامنا کرنا پڑا جب ان خوش آئند رپورٹوں کی بنیاد پر جو جنرل فیسی کے قلم کا شاہکار تھیں، اسے یہ کہا گیا کہ وہ طفلس پہنچ کر امام شامل کو شہنشاہ کی اطاعت کرنے پر آمادہ کرے۔

**اشیلتا کی مہم کے نتائج:**

اس میں شک نہیں کہ اشیلتا میں بظاہر فتح روسیوں کی ہوئی تھی لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ یہ درحقیقت شکست تھی۔ تلیتی سے جس طرح صلح کے ذریعے پسپائی اختیار کی گئی وہ اگر نہ ہوتی تو باقی ماندہ رُوسی فوج کے پرخچے اُڑ جاتے۔ اس مہم نے رُوسیوں کے خلاف نفرت کو کہیں زیادہ بڑھا دیا اور اس سے امام شامل کے اثر و رسوخ میں دس گُنا اضافہ ہو گیا۔ اشیلتا کے تباہ شُدہ مکانات اور باغات اور سُلگتے ہوئے کھنڈروں نے مقامی آبادی کے دلوں میں نفرت کا جو طوفان پیدا کیا تھا اس نے روسیوں کے مستقبل کو اس علاقے میں اور زیادہ غیر یقینی بنا دیا۔

امام شامل اشیلتا واپس پہنچے۔ ان کے جذبات کا اندازہ آپ خُود لگا سکتے ہیں۔ ہرا بھرا اور ہنستے بولتے لوگوں سے آباد گاؤں اب ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا۔ کھنڈر اپنا ماتم آپ کر رہے تھے۔ پانچ سو گھروں میں سے ایک گھر بھی سلامت نہیں تھا۔ وہ مسجد جہاں تین سال پہلے امام شامل کی امامت کا اعلان کیا گیا تھا، برباد کی جا چکی تھی۔

امام شامل کے اپنے الفاظ میں "میں نے جس طرف بھی دیکھا وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔

جیسے جنت کے رہنے والے رُوٹھ کر چلے گئے ہوں، پھلوں اور باغوں کا مسکن اب ویرانہ بن چکا تھا۔ انگوروں کی بیلیں جل چکی تھیں اور یہ آشیانہ اُجڑ چکا تھا۔''

کیا عجب کہ اس منظر سے ان کے دل میں انتقام کی نہ بُجھنے والی آگ بھڑک اٹھی ہو۔ وہ لوگ جنھوں نے لہلہاتی فصلوں اور باغوں کو محض اس لیے تباہ کر دیا کہ امام شاملؒ کا اثر و رسوخ ختم ہو جائے۔ وہ لوگ جنھوں نے بوڑھوں اور بچوں تک کو امان نہیں دی، جنھوں نے خدا کے گھر کو گولہ باری سے شہید کر دیا، جنھوں نے پھل دار درختوں سے انتقام لیا، کیا وہ اس بات کے مستحق نہ تھے کہ ان کے مظالم کا بھرپور جواب دیا جائے، امام شاملؒ اپنی قوّت سے اس اُجڑے ہوئے دیار کو سنوارنے میں مصروف ہو گئے اور انھوں نے رُوسیوں کو مار بھگانے کی کارروائیوں کے ساتھ ساتھ ایک مضبوط دفاعی حصار قائم کرنے کی کوشش بھی شروع کر دی۔

نکولائی کی آمد:

شہنشاہ نکولائی کو اسی سال موسم سرما میں قفقاز کے دورے پر آنا تھا۔ رُوسی اس حد تک مطمئن ہو چکے تھے کہ وہ اس موقع پر قفقاز میں امن و امان بحال ہونے کا جشن منانے کی سوچ رہے تھے۔ مگر اس مقصد کے لیے سب سے پہلے امام شاملؒ سے اطاعت قبول کروانے کا مرحلہ درپیش تھا۔ چنانچہ کمانڈر انچیف جنرل فیسی کو خُفیہ ہدایات جاری کی گئیں کہ جس طرح بھی ممکن ہو امام شاملؒ کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ شہنشاہ نکولائی کی آمد پر وہ طفلس یا کسی اور جگہ پچھلی زیادتیوں پر معافی مانگ لیں اور ساتھ ہی آئندہ کے لیے اس بات کی ضمانت بھی دیں کہ بعد میں کسی قسم کی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ جنرل فیسی نے جو اس وقت جنوبی داغستان میں تھا، یہ اہم کام جنرل کلنگو کے سپرد کیا۔ کلنگو اپنی بہادری، فوجی مہارت اور مقامی رسم و رواج سے اچھی طرح آگاہی کی بنا پر اس کام کے لیے موزوں تصور کیا گیا۔

کلنگو سے امام شاملؒ کی ملاقات:

ممکن ہے کلنگو کو اس نازک مشن کی کامیابی کے بارے میں کچھ شبہات ہوں لیکن شہنشاہ کے احکامات سے سرتابی کون کر سکتا تھا۔ اس نے کرنائی کے بیگوں کو خط لکھ کر امام شاملؒ سے

ملاقات کا بندوبست کرنے کے لیے کہا۔ دو روز بعد ۱۸ ستمبر کو چشمے پر ملاقات طے پائی۔ کلنگو وڈوکمیوف پندرہ کاسک سپاہیوں اور کرنائی کے رہنے والے دس حلیف مقامیوں کے ہمراہ چشمے پر پہنچا جہاں امامؒ دوسو مسلح افراد کے ساتھ پہلے سے مُنتظر تھے۔ رُوسی لیڈر نے اپنے ہمراہیوں کو پیچھے چھوڑ کر اپنے ساتھ ایک مترجم لیا اور ایک اُونچے ٹیلے پر پہنچ گیا۔ امام شاملؒ بھی باقی افراد کو پیچھے چھوڑ کر، جو قرآن پاک کی آیات بآواز بلند پڑھ رہے تھے، صرف تین معتقدین کے ہمراہ وہاں پہنچ گئے۔

یہ منظر یقیناً قابلِ دید ہوگا۔ ایک طرف روسی فوجی تھے جن کی کمان ایک نوجوان افسر کر رہا تھا۔ اس افسر کو کچھ ماہ پہلے اس جگہ چہرے پر گولی کا زخم لگا تھا اور دوسری طرف مختلف رنگوں کی عباؤں میں ملبوس مریدین تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر رُوس کی عظیم طاقت کا نمائندہ اور مریدین کے رہنما امام شاملؒ اپنے تین ہمراہیوں کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے۔ کچھ دیر کے لیے خاموشی رہی۔ قریبی چشمے سے پانی کی آواز فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی اور عیسائی جنرل اور مجاہدین کے رہنما ایک دُوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس احساس کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے کہ جنگ یا امن کا انحصار ان کے ان الفاظ پر ہے جو وہ ادا کرنے والے ہیں۔ رُوس کا یہ سفیر دلائل پر دلائل پیش کر رہا تھا اور ترغیب وتحریص کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ یُوں محسوس ہو رہا تھا کہ شاید امام شاملؒ پر اس کی باتوں کا کچھ اثر ہو رہا ہے۔ لیکن کچھ دیر بعد امام شاملؒ نے کہا کہ وہ اس معاملے میں اپنے مشیروں سے مشورہ کیے بغیر قطعی جواب نہیں دے سکتے۔

### ایک ناخوشگوار واقعہ:

دوپہر تین بجے کے لگ بھگ کلنگو اُٹھ کھڑا ہوا۔ امام شاملؒ بھی اُٹھے اور کلنگو نے وداع ہونے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن قبل اس کے کہ امام شاملؒ کلنگو سے مصافحہ کرتے، سرخائی خان نے جو کہ انتہائی پُرجوش اور جذباتی قسم کے مرید تھے امام شاملؒ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ یہ مناسب نہیں کہ مومنین کا رہنما کفار کا ہاتھ پکڑے۔ کلنگو اپنے مشن کی ناکامی سے پہلے ہی بھنایا

ہوا تھا، اس بے عزتی پر آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے اپنی بیساکھی [1] سرخائی خان کی پگڑی اتارنے کے لیے اُوپر اُٹھائی۔ ایک لمحے کی تاخیر ہو جاتی تو یہ کام ہو جاتا اور ساتھ ہی روسی جرنیل اور اس کے تمام ساتھی سرخائی اور اس کے ساتھیوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بن چکے ہوتے۔ شاید امام اور ان کے ساتھی بھی اس ہنگامے میں شہید ہو جاتے اور تحریک آزادی کا رُخ ہی کچھ اور ہوتا لیکن امام شاملؒ نے اس موقع پر دور اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک ہاتھ سے کلنگو کی بیساکھی اور دُوسرے ہاتھ سے سرخائی کو (جس کا خنجر آدھا باہر آ چکا تھا) روک دیا۔ انھوں نے بلند آواز سے اپنے ساتھیوں کو، جو تیزی سے نزدیک آ رہے تھے پیچھے ہٹ جانے کے لیے کہا اور کلنگو سے جلد چلے جانے کی درخواست کی۔ کلنگو آپے سے باہر ہو رہا تھا اور خطرے کی پروا کیے بغیر گالیوں اور مغلظات پر اُتر آیا تھا۔ اس موقع پر وڈوکمیوف اپنے کمانڈر کی جان خطرے میں دیکھ کر جلدی سے بھاگا اور اسے کوٹ سے کھینچتا ہوا نیچے لے آیا۔ کلنگو گھوڑے پر سوار ہوا اور شورا کی طرف روانہ ہو گیا۔ امام شاملؒ اپنے مریدوں کے ہمراہ غمری کی جانب چل پڑے۔ آیا امام شاملؒ صلح اور اطاعت تسلیم کر لینے کی رُوسی پیش کش کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہے تھے؟ اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ امام شاملؒ نے جس بات کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دے کر اس کے حصُول کے لیے ہر چیز کی بازی لگا دی تھی، وہ اس سے ہرگز دستبردار نہیں ہو سکتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اپنے مُشیروں سے اس بارے میں صلاح ضرور کی لیکن اگر دُوسرے مواقع پر امامؒ کے رویے کو مدّنظر رکھا جائے تو شاید وہ ان کی آزمائش کرنا چاہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس موضوع پر سوچنے کے لیے تیار نہ تھے کہ وہ رُوسیوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کر سکتے ہیں۔

### امام شاملؒ کا مختصر خط:

کلنگو، شہنشاہ کی خواہش کی تکمیل کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا چاہتا تھا۔ اس نے امامؒ کو ایک طویل خط لکھا جس میں اسی پہلی بات کو دہرایا گیا تھا۔ اس بار امامؒ کا جواب خاصا مختصر اور فیصلہ

[1] مریدین کے خلاف ایک جنگ میں کلنگو کا پاؤں زخمی ہو گیا تھا۔

کن تھا:

''اس خط کے حقیر مصنف امام شامل کی طرف سے جو تمام مُعاملات خُدا کے ہاتھ میں چھوڑتا ہے، ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء محض اطلاع دینا مقصود ہے کہ میں نے آخر کار طفلس نہ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ چاہے مجھے اس انکار پر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے کیونکہ مجھے آپ کی بدعہدی کا تجربہ ہے اور اس سے سب لوگ آگاہ ہیں۔''

امام شاملؒ اس بات سے اچھی طرح آگاہ تھے کہ جب تک داغستان کے تمام علاقوں میں تباہی و بربادی کے اثرات کو ختم نہ کر لیا جائے، روسی افواج سے دوبارہ ٹکر لینا ان کی تحریک کے حق میں مُفید نہ ہوگا۔ وہ پوری تندہی سے اس علاقے کی تعمیرِ نو اور قبائل میں اپنا اثر و رسُوخ بڑھانے میں مشغول ہو گئے۔ ایک طرف وہ اخالگو کی چٹانوں پر اپنا قلعہ بنا رہے تھے تو دوسری جانب قبائل کو منظّم کرنے کے لیے انھوں نے اپنی تمام تر کوششیں صرف کر رکھی تھیں۔

تعمیرِ نو:

امام شاملؒ جہاں انتہائی جری کمانڈر اور قابل سپہ سالار تھے، وہاں تنظیمی صلاحیتوں میں بھی بہت بڑی حد تک انھیں کمال حاصل تھا۔ اس قدر تباہ کن لڑائی کے بعد نئے سرے سے تمام علاقے کی تعمیر اور قبائل کا حوصلہ بحال کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ روسیوں کے ظلم و ستم نے بھی بہت بڑی حد تک داغستانیوں کے دل میں نفرت اور انتقام کی آگ بھڑکا دی تھی لیکن یہ امام شاملؒ کا کمال تھا کہ انھوں نے اس جذبے کو اپنی تحریک کے استحکام کے لیے مؤثر طور پر استعمال کیا۔ ان کی تحریک روز بروز مضبُوط ہوتی جا رہی تھی اور روسی حکومت کو بجا طور پر خطرہ محسوس ہُوا کہ امام شاملؒ کی بڑھتی ہُوئی طاقت کہیں ان کے لیے وبالِ جان نہ بن جائے۔ ۱۸۳۹ء کے آغاز میں رُوسی حکومت نے امام شاملؒ کے اثرات کی روک تھام کے لیے شمالی داغستان میں ایک فیصلہ کن مہم بھجوانے کا فیصلہ کر لیا۔

امام شاملؒ کی حکومت آویریا، آندی اور گومیٹ کے تمام علاقوں میں تسلیم کر لی گئی تھی۔ صرف اندالیال اور اونتوکول کے لوگوں نے غمری کے رہنے والوں سے نفرت کی بنا پر اسے تسا ے

نہیں کیا تھا۔ چیچنیا میں ان کے نائب تاشوف حاجی نے اس تمام علاقے میں تحریک کی بالا دستی کو تسلیم کروالیا تھا۔ سلاتو اور اوخ کے قصبوں نے کھلے بندوں امامؒ کی اطاعت تسلیم کر لی تھی اور سوائے ان علاقوں کے جو رُوسی سرحد سے ملحق تھے تمام علاقے امام شاملؒ کے زیرِ نگیں آ چکے تھے۔ رُوسی سرحد سے ملحقہ علاقے بھی سازگار وقت کے انتظار میں تھے۔ جنوبی داغستان میں بالائی سمور کے علاقے رُوس سے کھلم کھلا باغی ہو چکے تھے۔

بیرن روزن کی جگہ جنرل گولودن نیا کمانڈر انچیف بن چکا تھا۔ اس منصوبے میں شہنشاہ نکولائی نے ترمیمات کی تھیں اور وہ منصوبہ اب کچھ اس طرح تھا:

۱۔ بحیرۂ اسود کے ساحل پر اُترا جائے۔

۲۔ بالائی سمور کے علاقے کو زیر کیا جائے۔

۳۔ چیچنیا اور شمالی داغستان کو فتح کیا جائے۔ ہر ایک حصّے کے لیے الگ الگ فوج روانہ کی جائے اور اس طرح یہ منصوبہ مکمل کیا جائے۔

آیئے چیچنیا اور شمالی داغستان کے بارے میں منصوبے کا جائزہ لیں۔ اس علاقے کے لیے جو فوج منظّم کی گئی اس کی کمان جنرل کاؤنٹ گریب کے سپرد تھی۔ اس کا مقصد امام شاملؒ کے قلعے اخالگو کی تسخیر اور امامؒ کے اقتدار کا مکمل خاتمہ تھا۔ مشرقی حصے اور شمالی داغستان کی تمام فوجی قوت کاؤنٹ گریب کے سپرد کر دی گئی۔ اس فوج کی تعداد ۹۰۰۰ تھی جن میں سے ۲ ہزار فوجی ونز پایا اور ۳ ہزار تیمر خان شورا میں تھے۔ ارادہ یہ تھا کہ پہلے داغستان میں امام شاملؒ کے خلاف تمام تر قوت سے حملہ کیا جائے اور بعد میں موسم سرما میں چیچنیا کا رُخ کیا جائے لیکن مجاہدین کی کامیاب جنگی منصوبہ بندی کی وجہ سے روسی کمانڈر اپنے اس منصوبے پر عمل کرنے کے قابل نہ رہا۔

## مجاہدین کے دفاعی انتظامات:

حاجی تاشوفؒ نے سرخائی اور علی بیگؒ کی قیادت میں مریدین کی جماعت کی مدد سے اخمت قلعہ کے مقام پر سکیت کے قریب جنگل کے بیچوں بیچ لکڑی کا ایک مضبوط حصار بنا لیا تھا۔

چیچنیا کے مجاہدین بھی دُور دُور سے یہاں پہنچ گئے تھے اور ان کی موجودگی کی وجہ سے دشمن کی فوج ونزپایا سے داغستان کے راستے پر پیش قدمی کرنے کے قابل نہ تھی۔ امام شاملؒ نے دوسری طرف گمبیٹ میں ارغونی کے مقام پر دفاعی انتظامات کر رکھے تھے اور بورتونائی کے لوگوں سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ سلاتو کے علاقے میں رُوسیوں کا مقابلہ کریں گے۔ رُوسی کمانڈر کے لیے یہ صُورت حال خاصی خطرناک تھی۔ کیونکہ اگر ونزپایا سے داغستان کی طرف فوجیں لے کر بڑھتا تو حاجی تاشوف اور ان کے مجاہدین اس فوج کو رستے ہی میں ختم کر دیتے اور ساتھ ہی رسل ورسائل کا سلسلہ بھی منقطع ہو جاتا۔ یُوں پنجرے میں بند ہو جانے کے خطرے کے پیش نظر رُوسی کمانڈر نے پہلے حاجی تاشوفؒ اور ان کے مجاہدین سے مقابلے کا فیصلہ کیا۔

حاجی تاشوفؒ کے دفاعی حصار کو سر کرنے کے بعد روسی افواج آگے بڑھیں۔ مجاہدین نے جنگل میں گوریلا جنگ کے ذریعے رُوسی افواج کو خاصا نقصان پہنچایا۔ کاؤنٹ میلوٹین ان ہی جھڑپوں میں شدید زخمی ہوا۔ حاجی تاشوفؒ نے اپنی قوت کو ضائع ہونے سے بچالیا اور ساتھ ہی ساتھ دشمن پر کاری ضربیں لگائیں۔ رُوسی افواج ونزپایا سے ۲۱ مئی ۱۸۳۸ء کو روانہ ہُوئیں اور اگلے روز شورا میں موجود تین بٹالین بھی ان کے ہمراہ ہوگئیں۔ جنرل گریب نے ارگونی پر حملے کا حکم دے دیا۔ ارگونی کا قصبہ ایک اُونچی جگہ پر واقع تھا۔ اس کے ایک طرف دریا تھا اور دوسری طرف پہاڑ کی چوٹی پر مکانات کا سلسلہ تھا۔ تمام گاؤں بیضوی شکل میں بنا ہوا تھا اور ہر جانب سے دفاع کا انتظام موجود تھا۔ یہاں امام شاملؒ نے رُوسیوں کے مقابلے میں ۱۶ ہزار مجاہدین اکٹھے کر لیے تھے۔ دفاعی حصار میں موجود افراد کی تعداد کافی کم تھی کیونکہ آندی کے افراد زیادہ تر قریبی پہاڑوں میں ہی رہے اور انھوں نے لڑائی میں بہت کم حصہ لیا۔

۳۰ مئی کی شام کو روسی توپ خانے نے بھرپُور حملہ کر دیا۔ اسی اثنا میں کرنل لینٹسوف کی قیادت میں ایک کالم دائیں جانب سے اور دُوسرا کالم کرنل پلو کے زیرِ کمان بائیں طرف سے حملہ آور ہُوا۔ شام ہو چکی تھی اور پہاڑوں پر توپیں لے جانے میں کافی دشواری پیش آ رہی تھی۔ رات کے حملے میں ناکامی پیش آئی چنانچہ اگلی صبح نئی کمک کے ساتھ دوبارہ حملہ شروع ہوا۔ حملے

سے پہلے رُوسی توپ خانے نے چاروں طرف سے گولے برسانے شروع کر دیے اور مقررہ وقت پر گولہ باری بند ہوتے ہی رُوسی حملہ آور ٹوٹ پڑے۔ دست بدست جنگ شروع ہوگئی جس کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔ میلوٹین، جو ایک کالم کی قیادت کر رہا تھا اس حملے کے بارے میں لکھتا ہے:

''صبح ۹ بجے تک ہم گاؤں کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر چکے تھے لیکن پھر بھی رات ہونے تک ہر جگہ خُونریز مقابلہ جاری رہا مریدین کو ان کے محصُور گھروں سے نکالنے کا ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ یہ کہ چھتوں میں سُوراخ کر کے اندر آتش گیر مادہ پھینکا جائے تاکہ لکڑی کے شہتیروں کو آگ لگ جائے۔ پھر بھی وہ کئی گھنٹوں تک گھروں میں ڈٹے رہے۔ کئی بار وہ خُفیہ رستوں سے ایک گھر سے دوسرے گھر میں چلے جاتے۔ ہمیں کئی جلی ہُوئی لاشیں ملیں۔ وہ فوجی اعتبار سے کمزور ہونے کے باوجود آخر دم تک لڑتے رہے۔ کئی بار تو ایسا ہُوا کہ لڑتے لڑتے انھوں نے ہمارے کئی آدمیوں کو ہلاک کر دیا۔ شدید زخمی ہونے کے باوجود اُن کے جذبات کی شدت میں کوئی کمی نظر نہ آتی تھی۔ وہ اپنی تلواروں اور خنجروں سے اس وقت تک ہمارا مُقابلہ کرتے رہتے جب تک کہ ہماری سنگینیں ان کا کام تمام نہ کر دیتیں۔ کئی بار نہتے افراد درجن بھر یا اس سے بھی زیادہ سپاہیوں کی صفوں پر ٹوٹ پڑتے۔ صرف پندرہ افراد نے ہم سے امان طلب کی۔ ان کا ایک گھر میں، جہاں ہم نے دستی بم پھینکے تھے، دم گُھٹا جا رہا تھا۔ دشمن کا بھاری تعداد میں جانی نقصان ہُوا۔ گلیاں نعشوں سے اٹی ہُوئی تھیں۔

دن ڈھلنے تک گاؤں کا خاصا بڑا حصّہ دشمن کے ہاتھوں میں آ چکا تھا۔ گاؤں کے مشرقی حصے میں خاصی بلندی پر واقع ایک بُرج نے ہمیں کافی نقصان پہنچایا۔ پیادہ فوج کی کوششیں ناکام ہونے پر ہم توپ خانے کی مدد حاصل کرنے پر مجبور ہو گئے۔ پھر بھی ان کوہستانیوں نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ رات کے وقت ان میں سے

کافی لوگ مختلف سمتوں میں بھاگ گئے۔ بارش اور تاریکی نے ان کی مدد کی۔ ان میں سے بہت کم ہماری فائرنگ کی زد سے بچ سکے ہوں گے لیکن پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ یہ خاصا دلیرانہ اقدام تھا۔

ارگونی کی یہ جنگ ۳۰ مئی شام چار بجے سے یکم جُون کی صُبح تک جاری رہی۔ ہمارے مقتولین کی تعداد ۶ افسر اور ۱۴۰ سپاہی تھی۔ ۵۰۰ افراد جن میں ۱۳۰ افسر بھی شامل تھے، زخمی ہُوئے۔ دشمن کی ۵۰۰ لاشیں ہمارے ہاتھ آئیں۔ بعد میں ہمیں معلوم ہُوا کہ دشمن کے دو ہزار افراد مارے گئے ہیں۔ کئی دیہات ایسے تھے جن میں ایک شخص بھی بچ کر واپس نہ جاسکا۔"

ارگونی کے پانچ سو گھروں میں ایک گھر بھی رُوسیوں کی چیرہ دستی سے محفوظ نہ رہ سکا تھا۔ شہتیر تک جلا دیے گئے تھے اور تمام گاؤں کھنڈر بن گیا تھا۔

اس اثناء میں لیتنیسٹوف اور پلو کو میجر جنرل کے عہدے پر ترقی دے دی گئی تھی۔ میجر جنرل لیتنیسٹوف کی قیادت میں ایک کالم اشیلتا کے بالمقابل پہنچا لیکن اشیلتا خالی کیا جاچکا تھا اور آندی دریا کے پُل کو مقامی باشندوں نے جلا دیا تھا اب صُورتِ حال خاصی نازک ہوگئی تھی کیونکہ روسی اپنے مستقل ٹھکانے ونز پایا سے کٹ چکے تھے اور دوسری طرف شورا کا راستہ بھی منقطع ہوگیا تھا۔ اردگرد کے تمام علاقوں پر مجاہدین کا مکمل قبضہ تھا۔ اس جگہ سے تین میل اُوپر ایک مقام پر پُل تھا لیکن یہ راستہ بہت دُشوار گزار تھا۔ کرنل کٹیا نائن کسی طرح یہاں پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہاں بھی پُل جلا ہُوا تھا لیکن قریبی مکانوں سے شہتیر نکال کر ان کی مدد سے پُل بنا لیا گیا اور اس طرح فوج دُوسرے کنارے پر اُتر گئی۔ دُوسری طرف سے کمک پہنچ گئی تھی اور رسے کی مدد سے دوسرے کنارے پر بھو کے سپاہیوں کو بسکٹ پہنچائے گئے۔ آندی دریا کے پُل کو بھی دوبارہ تعمیر کرلیا گیا تھا۔ جنرل گریب کچھ افراد کو پُل کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر آگے بڑھا اور اس جنگ کے مشہور محاصرۂ اخالگو کا آغاز ہُوا۔

## محاصرۂ اخالگو:

امام شاملؒ اخالگو کے قلعے میں مردوں، عورتوں اور بچوں سمیت محصُور ہو گئے۔ ان میں مختلف قبیلوں اور دیہاتوں سے یرغمال میں آئے ہوئے افراد بھی تھے۔ کل آبادی کا صرف چوتھائی حصہ لڑائی میں حصہ لینے کے قابل تھا اور یہ صورت حال خاصی تشویشناک تھی کیونکہ رسد کا سامان محدُود تھا۔ پانی لانے کے راستے بھی خاصے مخدوش اور خطرناک تھے اور پانی سیکڑوں فٹ نیچے تھا۔

اخالگو کے دو حصے ہیں۔ ایک نیا اخالگو اور دُوسرا پُرانا اخالگو۔ دریائے آندی ان دونوں کے باہر تین طرف سے ہو کر گزرتا ہے۔ نیا اخالگو اور پُرانا اخالگو دریائے اشیلتا کی وجہ سے ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ نیا اخالگو پُرانے سے خاصا بلندی پر واقع ہے اور نئے اخالگو کو جانے کا راستہ سرخائی کے بُرج کی وجہ سے بالکل غیر محفوظ ہے۔ پُرانے اخالگو تک دریائے اشیلتا کے کنارے کنارے ایک انتہائی خطرناک رستے کے ذریعے پہنچا جا سکتا ہے۔ دوسری صورت میں نئے اخالگو سے ایک تنگ پُل کے ذریعے بھی پہنچا جا سکتا ہے۔

سرخائی کے بُرج کی کمان امام شاملؒ کے انتہائی بہادُر اور زیرک کمانڈر علی بیگ کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے ہمراہ ایک سو جاں نثاروں کا دستہ تھا۔ دریائے آندی سے پانی لانے کے لیے اُنھیں نیچے اُترنا پڑتا تھا اور یہ بات رُوسیوں کی فائرنگ کا سامنا کیے بغیر ممکن نہ تھی۔ سرخائی خانؒ اس وقت اگالی کے گاؤں میں امام شاملؒ کے نائب کی حیثیت سے مقیم تھے۔ آخوردی ماہومؒ بوگیال ضلع میں آندی کے مقام پر متعیّن تھے۔ ان علاقوں کے لوگ روسیوں کی کامیابیوں کا سُن کر خاصے متذبذب ہو رہے تھے اور اگر اُنھیں اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو یہ علاقے شاید رُوسیوں کی باج گزاری قبول کر لیتے۔

## رُوسیوں کی طاقت:

اب جنرل گریب کے پاس ۹ بٹالین کی نفری تھی۔ لیکن لڑائی اور بیماریوں کی وجہ سے لڑنے والوں کی تعداد چھ ہزار رہ گئی تھی۔ اس کے علاوہ ساڑھے تین ہزار کے لگ بھگ ملیشیا

بھی مدد کے لیے موجود تھی۔ کم تعداد کے باعث جنرل گریب نے تمام فوجی قوت کو دائیں طرف لگا دیا۔ اس طرح امام شاملؒ کو خاصی سُہولت ہوگئی کیونکہ وہ اب رسد اور آدمیوں کی مدد حاصل کر سکتے تھے اور ساتھ ہی آخوردی ماہوماؒ، سرخائیؒ اور دُوسرے ساتھیوں سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی قائم رکھ سکتے تھے جو کمک حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا۔

ان حالات میں جنرل گریب نے جنرل گولوون سے مزید کمک مانگی۔ انھی دنوں سمور کی مہم ختم ہوئی۔ اس لیے کمانڈر انچیف نے تین بٹالین اور چار توپیں دیگر رسد کے ساتھ بھجوا دیں۔ ڈھائی ہزار کی اس تازہ کمک سے روسی فوج کی کُل تعداد بارہ ہزار تک جا پہنچی۔ دُوسری طرف مجاہدین بھی دفاعی انتظامات سے غافل نہ تھے۔ آخوردی ماہوما، سرخائی اور گلبات نے بڑی تعداد میں مجاہدین بھجوائے۔ خیال تھا کہ اس بڑی تعداد کے پیشِ نظر جنرل گریب محاصرہ اُٹھا لینے پر مجبور ہو جائے گا۔ ۱۸ اور ۱۹ جون ۱۸۳۸ء کی درمیانی رات کو آخوردی ماہوماؒ نے اشیلتا کی بلندی پر مورچے لگا دیے۔ اس اثناء میں رُوسی ہیڈکوارٹر سٹاف کے افراد مجاہدین کی موجودگی سے بے خبر امام شاملؒ کی پوزیشنوں کا اندازہ لگانے کے لیے پہنچ گئے تھے۔ اس وقت اگر ماہوماؒ اور ان کے مجاہدین ہیڈکوارٹر پر حملہ کر دیتے تو جنگ کا نقشہ ہی مختلف ہوتا لیکن انھوں نے اس نازک اور قیمتی وقت کو ہاتھ سے کھو دیا۔

مجاہدین کا حملہ:

۲۰ جون کی صبح کو مجاہدین نے قرآن پاک کی آیات کا ورد کرتے ہوئے حملہ کر دیا لیکن انھوں نے فائرنگ جلد کھول دی جس کی وجہ سے رُوسیوں کو سنبھلنے کا موقع مل گیا اور وہ بھی اسی اثناء میں حملہ آور ہو گئے۔ مجاہدین نے شکر تیل اور اگالی میں پناہ لی۔ رُوسی کمانڈر نے جنرل گالافیف کو امام شاملؒ کے محاصرے کے لیے چھوڑ کر شکر تیل تک مجاہدین کا پیچھا کیا اور پھر اگالی کی طرف بھی تعاقب کیا۔ ان دو مقامات پر مریدین نے اپنے لشکر کا کچھ حصہ محاصرے کے دوران دیکھ بھال کے لیے مُتعیّن کیا تھا۔ امام شاملؒ نے محاصرے کی فوج کا کچھ حِصہ مصروف دیکھ کر ایک اچانک اور زوردار حملہ کیا لیکن رُوسیوں نے یہ حملہ پسپا کر دیا۔ ۲۳ جون کی شام کو

تمام رُوسی افواج اپنی اپنی جگہ واپس آ چکی تھیں۔

محاصرہ جاری تھا۔ توپ خانے کی چھ بیٹریوں نے اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی تھی اور بارُودی سُرنگیں بچھانے والے دریائے اشیلتا اور دریائے بٹل کے کنارے کنارے آگے بڑھ رہے تھے اس کے علاوہ شورا کے ساتھ ایک اور راستہ کُھل گیا جو انتوکول اور غمری سے ہو کر گزرتا تھا۔ اس سے پہلے اس راستے پر ایک پُل تباہ ہو چکا تھا جس کی وجہ سے یہ راستہ بند پڑا تھا۔ گریب نے اس راستے کو بہتر بنانے کے لیے ایک پیادہ فوج کی کمپنی روانہ کی لیکن اس کام میں تقریباً دو ماہ لگ گئے۔ امام شاملؒ کی زندگی کے اس بُحران میں غمری کے لوگوں کا رویہّ تسلی بخش نہ تھا۔ جب رُوسیوں کو شکست ہوتی دیکھتے تو وہ امامؒ کا ساتھ دینے لگتے ورنہ روسیوں کے ساتھ مل جاتے۔ شروع میں جب آندی کے بائیں کنارے کے راستے سے رسل و رسائل کا راستہ کُھلا تھا تو غمری کے لوگوں نے امام شاملؒ کی حوصلہ افزائی کی لیکن جب جنرل گریب نے اولو بیگ کو ان پر کوتوال مقرر کر دیا تو وہ رُوسیوں کے مُطیع ہو گئے اور شورا کے ساتھ روسی رسل و رسائل کے راستے میں انھوں نے کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ کوفیوں کی طرح ان کے دل امام شاملؒ کے ساتھ اور تلواریں رُوسیوں کے ساتھ تھیں۔

### سرخائی کا قلعہ:

نئے اخالگو کا سرخائی کی چٹان سے رابطہ ایک تنگ راستے کی وجہ سے قائم تھا جسے صرف ایک شخص ایک وقت میں عبور کر سکتا تھا۔ اس جانب محاصرہ کرنے والی فوجیں آہستہ آہستہ بڑھتی گئیں حتیٰ کہ ایک رات اندھیرے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایک کمپنی سرخائی کی چٹان کے نزدیک ایک محفوظ جگہ پر پہنچ گئی اور چٹان کو ہر طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ اس کے باوجود نڈر مجاہدین ہر رات نئے بٹل تک پانی کے لیے جاتے رہے۔ جب تک یہ مضبوط جگہ موجود تھی رُوسیوں کو کسی فیصلہ کُن بات کی توقع نہ تھی اس لیے جنرل گریب نے اس پر بھرپور حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

۲۹ جون کو پو پھٹتے ہی توپ خانے کی تین بیٹریوں نے سرخائی کے قلعے پر گولہ باری شروع

کر دی لیکن اس سے بہت کم نقصان ہُوا۔ یہ قلعہ اتنی بلندی پر تھا اور چٹانوں میں اس طرح چھپا ہوا تھا کہ اس پر مؤثر گولہ باری خاصی مشکل تھی۔ صبح ۹ بجے کے قریب رجمنٹ کی دو بٹالین چٹان کے نیچے تک پہنچ گئیں۔ رُوسی فوجیوں نے ۴۵ درجہ زاویے کی اس چٹان پر چڑھنے کی کوشش شروع کر دی اور برستے ہوئے پتھروں اور لکڑی کے شہتیروں کے باوجود اُوپر چڑھتے گئے۔ لیکن اس چٹان کا اُوپر کا حصہ ناقابل تسخیر تھا۔ انھوں نے ایک دُوسرے کے کاندھوں پر سوار ہو کر اُوپر چڑھنے کی کوشش کی لیکن جو رُوسی سپاہی بھی سامنے آتا، نشانہ بن جاتا۔ اس کے ساتھ ہی حملہ آور گروہ کو ایک جانب سے شدید فائرنگ کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ اتنا مضبوط مورچہ تھا کہ توپخانے کے فائر کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہُوا۔

حملہ آوروں کے مشن کو کامیاب بنانے کے لیے توپ خانہ بار بار گولہ باری کرتا رہا لیکن ہر بار حملہ آوروں پر پتھر اور شہتیر گرتے۔ قلعے پر ہونے والی گولہ باری سے دُھول اُڑ رہی تھی جس سے مجاہدین کے پُرعزم چہرے کچھ دیر کے لیے چھپ جاتے لیکن جُونہی گرد بیٹھتی جانباز مریدین کی پیشانیاں دوبارہ اُبھرتیں اور مزید رُوسی خاک اور خون میں لتھڑ کر نیچے جا پڑتے۔ ہر بار مجاہدین نعروں کی گونج سے پتھروں کی بُوچھاڑ کرتے۔ یہ خون ریز معرکہ کئی گھنٹے جاری رہا۔ ایک کمپنی کے بعد دوسری کمپنی حملے کے لیے آگے بڑھتی رہی۔ کبارڈی رجمنٹ کی دو بٹالین شام کے چار بجے بھجوائی گئیں لیکن مزاحمت اتنی شدید تھی کہ قلعہ کسی طرح سر نہ ہو سکا۔ اس تمام دن کی لڑائی میں روسیوں کے ۳۰۰ سپاہی کام آئے۔ رُوسیوں کے عزم کی بھی داد دینی چاہیے کہ اس شدید مزاحمت کے باوجود انھوں نے حملے کو جاری رکھا۔ یہ حملہ ناکام رہا لیکن امام شاملؒ کے بہادر ساتھی علی بیگؒ نے جامِ شہادت نوش کیا کئی دوسرے مجاہدین بھی شہید ہو گئے۔

### رُوسی توپخانے کی گولہ باری:

اسی اثناء میں توپ خانے کو اور زیادہ اچھی جگہوں پر متعین کر دیا گیا تھا۔ بڑی توپیں سامنے لائی گئیں اور ان کی گولہ باری سے یہ ناقابلِ تسخیر قلعہ کھنڈر کی صُورت اختیار کر گیا جس میں قلعے کے کئی بہادر محافظ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سو گئے۔ اس تباہی کے باوجود جب بھی حملہ آور

ٹوٹی دیوار کی طرف بڑھتے۔ مریدین چیتوں کی طرح لپکتے اور ان پر پتھر لُڑھکاتے۔ اس درجہ شدید مزاحمت کی وجہ سے رُوسی فوج پیچھے ہٹ گئی۔ رات کو دیر تک توپ خانے کی گولہ باری جاری رہی۔ مجاہدین کی ایک بڑی تعداد یا تو شہید ہو چکی تھی یا ملبے میں دب گئی تھی۔ جو مجاہدین باقی رہ گئے، انھوں نے مزید مقابلے کو بے سُود سمجھ کر پسپائی اختیار کی۔ صبح کو رُوسی فوج قلعے کے کھنڈروں میں داخل ہوئی تو وہاں اسے صرف چند زخمی مجاہد ملے۔ اس بار رُوسیوں کے ۱۲ سپاہی، جن میں ایک افسر بھی تھا، ہلاک اور ۹۵ زخمی ہُوئے۔ محاصرے کا دائرہ مزید تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ سرخائی کے قلعے سے مزاحمت ختم ہونے کے بعد اب رُوسیوں کو آگے بڑھنے میں زیادہ دُشواری کا سامنا نہیں تھا۔ اس اثنا میں توپ خانے کو نئی جگہوں پر نصب کر دیا گیا تھا اور گولہ باری تمام رات جاری رہی۔ مجاہدین بھی بھرپور حملے کرتے رہے۔

عام حملہ:

۱۲ جولائی ۱۸۳۸ء کو جنوبی داغستان سے مزید کمک پہنچی تو جنرل گریب نے اسے تین دن آرام کرنے کے لیے دیے اور اس کے بعد یہ سمجھتے ہُوئے کہ اب محاصرہ اس مرحلے میں پہنچ گیا ہے کہ اخالگو پر حملہ کامیاب رہے گا، اس نے ۱۶ جولائی کو حملے کا حکم دے دیا۔ اسے مقامی مُخبروں سے یہ رپورٹیں ملی تھیں کہ محصُورین کی حالت خراب ہے، ان کے مویشی چارہ نہ ہونے کی وجہ سے مر چکے ہیں۔ ایندھن نہ ہونے کی وجہ سے وہ کھانا تک نہیں پکا سکتے اور مُسلسل گولہ باری کی وجہ سے غاروں اور تہ خانوں میں پناہ گزین ہو گئے ہیں۔ مسلسل تھکن اور بے آرامی نے ان کی حالت تباہ کر رکھی ہے اور نعشوں کے تعفُّن کی وجہ سے ان کے حوصلے پست ہو رہے ہیں۔ ان رپورٹوں میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ مزاحمت بہت معمولی ہو گی اور یہ کہ امام شاملؒ بھی بھاگنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ تاہم واقعات نے ثابت کر دیا کہ مقامی مُخبروں اور رُوسی کمانڈر نے محصُورین کی ہمت اور عزم کے بارے میں غلط اندازہ قائم کیا تھا۔

حملے کے لیے تین [1] کالم تشکیل دیے گئے۔ پہلا کالم جس کی کمان بیرن رینگل کے سپرد

[1] کالم اس متحرک دستے کو کہتے ہیں جو کسی خاص مشن پر ایک کمان کے تحت ایک دوسرے کے پیچھے جا رہا ہو اور اس کے افراد کی تعداد متعین نہیں۔

تھی، تین بٹالین ❶ پر مشتمل تھا اور اسے نئے اخالگو پر حملہ کرنا تھا۔ ایک اور کالم کو جو کرنل پوپوف کی قیادت میں تھا، پُرانے اخالگو پر حملہ کرنا تھا اور تیسرے کالم کا کام یہ تھا کہ وہ اُونچائی پر پہنچ جائے اور سب سے اہم پوزیشن پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے۔ صبح سے دو بجے تک توپ خانہ لگاتار گولہ باری کرتا رہا۔ پھر تمام کالم اپنی اپنی پوزیشنوں پر پہنچ گئے۔

۵ بجے حملے کا حکم دیا گیا۔ رینگل کے کالم نے شدید مزاحمت کے باوجود تنگ راستے میں ایک قطار میں ہو کر سیڑھیوں پر چڑھنے کی کوشش شروع کر دی۔ یہاں پر انھیں ایک رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک جگہ دو خفیہ مورچوں سے دوطرفہ فائر کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ چند لمحوں میں اس کالم کی حالت انتہائی نازک ہوگئی۔ دونوں طرف سے بلند و بالا چٹانوں سے گھرے ہُوئے تنگ راستے میں ۶۰۰ افراد کا ہجوم تھا اور گولیوں کی بوچھاڑ لحہ بہ لحہ تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں راستہ ہلاک اور زخمی ہونے والوں سے پٹ گیا اور اب صُورت حال یہ تھی کی نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ یہ رُوسیوں کی خوش قسمتی تھی کہ کچھ دیر بعد اندھیرا چھا گیا ورنہ اس کالم کا ایک ایک شخص مارا جاتا۔

دُوسرا کالم آگے بڑھا تو پُرانے اخالگو کی طرف سے اس پر گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور ساتھ ہی دائیں جانب سے پتھر گرنے شروع ہو گئے۔ جب انھوں نے یہ صُورتِ حال دیکھی اور پہلے کالم کی ناکامی کا بھی انھیں پتہ چلا تو یہ کالم بھی پسپا ہوگیا۔ تیسرے کالم نے سرے سے کسی قسم کی کوشش ہی نہیں کی۔ اندھیرے میں یہ تینوں کالم واپس مقامِ آغاز پر پہنچے۔ یہ حملہ بُری طرح ناکام رہا اور رُوسیوں کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ ان کے ۷ افسر اور ۱۴۹ سپاہی مارے گئے اور ۴۵ افسر اور ۱۹۷ سپاہی زخمی ہوئے۔ دُوسری طرف محصورین کا نقصان بہت کم ہُوا۔ صرف ۱۵۰ مجاہدین شہید یا زخمی ہوئے۔ ان مجاہدین نے اس حملے کو روکنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ عورتیں مردانہ لباس میں اگلے مورچوں پر انتہائی دلیری سے لڑتی رہیں۔

---

❶ بٹالین کی تعداد عام طور پر ۸۰۰ سے ایک ہزار تک ہوتی ہے اور اس کی کمان لیفٹیننٹ کرنل کرتا ہے۔

رُوسی کمانڈر کو سخت ہزیمت اور جانی نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم اس نے ایک لمحے کے لیے بھی محاصرہ اُٹھا لینے کے بارے میں نہیں سوچا۔ اس کا غُرور پاش پاش ہو چکا تھا لیکن پھر بھی وہ ناکامی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس کی انا نے شاید اسے اس فیصلے پر مجبور کیا ہو کہ وہ محاصرے کو جاری رکھے۔ لیکن اس فیصلے کے سیاسی و فوجی پہلو بھی خاصے اہم تھے۔ اگر امام شاملؒ کو ان کے حال پر چھوڑ کر محاصرہ اُٹھا لیا جاتا تو رُوسی حکومت شاید پھر کبھی قفقاز کا رُخ نہ کر سکتی اور اس کی ساکھ مٹی میں مل جاتی۔ پھر اس مہم کے لیے جس قدر جانی و مالی نقصان برداشت کرنا پڑا تھا وہ سب کا سب اکارت جاتا اور مریدیت کا جھنڈا تمام داغستان اور چیچنیا میں لہرا رہا ہوتا۔

## جنرل گریب کا نیا منصوبہ:

جنرل گریب نے اپنی شکست کی وجوہات پر غور کیا تو یہ بات اس کی سمجھ میں آئی کہ جب تک محصُورین کو باہر سے کمک ملتی رہے گی رُوسیوں کی فتح غیر یقینی رہے گی۔ مُخبروں نے اسے اطلاع پہنچائی کہ حملے کے دُوسرے دن تُرکی [1] سے ۱۰۰ مجاہدین مزید پہنچے ہیں اور یہ کہ بارُود اور رسد برابر باہر سے آ رہی ہے۔ ایک اور اہم بات یہ تھی کہ زخمی اور بیمار باہر بھجوائے جا رہے تھے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ دریا کو دوبارہ عبُور کیا جائے۔ لیکن یہ آسان مسئلہ نہ تھا۔ تنکاٹ کا پُل تباہ کیا جا چُکا تھا اور سگرتیل کے پُل پر مجاہدین کا قبضہ تھا۔ کچھ دن یونہی گزر گئے۔ پُرانے اخالگو سے کچھ اور اُوپر ایک جگہ یہ ظاہر کیا گیا کہ جیسے رُوسی پُل بنا رہے ہیں۔ یہ ایک چال تھی تاکہ مجاہدین کی توجہ اس طرف مبذول ہو جائے۔ اس بہانے سے رُوسیوں نے تنکاٹ کے تباہ شدہ پُل کو جلدی سے مرمت کیا اور تین کمپنیاں دریا کی دُوسری طرف اُتار دیں۔ اگلے دن دو بٹالین اور کچھ ملیشیا بھی دریا کے پار اُتر گئی۔ اب اخالگو پہلی بار مکمل طور پر گھیرے میں آ گیا تھا۔ تقریباً ایک ماہ یونہی گزر گیا۔ اس دوران رُوسیوں کے ۱۰۰ کے قریب افراد ہلاک ہو چکے تھے۔ لیکن حفظانِ صحت کا مناسب انتظام نہ ہونے کی وجہ سے فوج کی تعداد کل ۶ ہزار رہ گئی تھی۔ دوسری

[1] داغستان کا ایک قصبہ

جانب امام شاملؒ اور ان کے مجاہدین کی حالت بھی روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی۔ غاروں کے سوا اور کوئی جگہ محفوظ نہیں تھی جہاں عورتوں اور بچوں کو رکھا گیا تھا۔ پانی لانے کے لیے روسیوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور ایندھن نہ ہونے کے برابر تھا۔ لاشوں کی وجہ سے فضا میں تعفّن پھیلا ہوا تھا اور کسی طرف سے کمک ملنے کی کوئی اُمید نظر نہیں آ رہی تھی۔

### خطرناک صورتِ حال:

ان حالات میں یہ بات قطعاً تعجب خیز نہیں تھی کہ امام شاملؒ جیسا شخص بھی حوصلہ ہار جاتا۔ ترکی کے نمبردار جمالہ نے مصالحت کی بات پہلے بھی کی تھی لیکن جنرل گریب نے انھیں کہا تھا کہ وہ شامل کی مکمل اطاعت اور اس کے بیٹے جمال الدین کے یرغمال کے طور پر پیش کیے جانے کے علاوہ اور کسی بات پر راضی ہونے کے لیے آمادہ نہیں۔

۲۷ جولائی ۱۸۳۸ء کو مذاکرات شروع ہوئے اور چند گھنٹوں کے لیے توپخانے نے گولہ باری بند کر دی۔ لیکن امامؒ جنرل سے دب کر بات کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور دُوسری طرف جنرل گریب مُصر تھا کہ امامؒ اس سے مفتوح کی حیثیت سے بات کریں۔ اگست کے شروع میں کبیت ماہوماؒ نے جو کہ تلیتی کے مشہور قاضی تھے، مصالحت کی پیش کش کی لیکن گریب نے اسے منظور نہیں کیا۔ ۱۲ اگست کو امام شاملؒ نے رُوسی ہیڈ کوارٹرز میں اپنا ایک سفیر بھجوا دیا اور ایک بار پھر چند گھنٹوں کے لیے گولہ باری رُک گئی۔ امامؒ اپنی قلعہ بندیوں کی مرمت کے لیے مُہلت چاہ رہے تھے۔ ۱۶ اگست کو انھیں یہ الٹی میٹم ملا کہ اگر انھوں نے اپنے بیٹے کو بطور یرغمال نہ بھیجا تو اگلی صُبح حملہ کر دیا جائے گا۔ چونکہ ۱۷ اگست کی صبح تک اس الٹی میٹم کا کوئی جواب نہیں ملا تھا اس لیے رُوسیوں نے حملے کا آغاز کر دیا۔ اس فوج کے بھی تین کالم بنائے گئے تھے لیکن پہلے کی طرح اس حملے میں بھی رُوسی افواج کو شدید نقصان اُٹھانا پڑا۔ دو افسر اور ۱۰۰ سپاہی ہلاک ہوئے۔ ۶ افسر اور ۴۵۵ سپاہی زخمی ہوئے۔ باقی فوج تھک چکی تھی اور مجاہدین کی تمام پوزیشنیں اسی طرح مضبوط تھیں۔ اس بار پھر ناکامی منہ کھولے کھڑی تھی اور ایک اور شکست رُوسی کمانڈر کا منہ چڑا رہی تھی۔

## سرخائیؒ کی شہادت:

مریدین اس بار بھی اپنی گزشتہ روایات کے مُطابق انتہائی بے جگری سے لڑے تھے لیکن اس دفعہ ہر طرف سے مُقابلہ کرنا پڑا تھا اور اس وجہ سے شہید ہونے والوں کی تعداد خاصی تھی۔ امام شاملؒ کے قریب ترین لوگوں میں سے ایک ممتاز شخصیت سرخائی بھی اس معرکے میں شہید ہو گئے تھے۔ وہ امام کے دستِ راست سمجھے جاتے تھے اور یہ وہی پُر جوش مجاہد تھے جنھوں نے جنرل کلنگو کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔ سُورج سے تپتی ہُوئی چٹانوں پر زخمیوں اور لاشوں کے ڈھیر لگے ہُوئے تھے۔ فاقہ زدہ عورتیں اور بچے اس منظر کو اور بھی مغموم بنا رہے تھے۔ مزید جدوجہد اب بہادر سے بہادر کوہستانیوں کو بھی بے سُود نظر آ رہی تھی۔ امام شاملؒ بالآخر اپنا بارہ سالہ بیٹا جمال الدین بطور یرغمال روسیوں کو دینے پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن وہ برابر اس کی بازیابی کی کوشش کرتے رہے اور بالآخر کئی برسوں کی جدوجہد کے بعد اسے واپس لے لیا۔ جمال الدین اس عرصے میں ان کے لیے اجنبی بن چکا تھا اور زار کی فوج میں لیفٹینٹ کے عُہدے پر فائز ہو چکا تھا۔ امامؒ جمال الدین کی واپسی کے لیے جس طرح مُضطرب رہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے شفیق باپ تھے۔

## مذاکرات:

جنرل گریب مذاکرات پر رضامند ہو گیا۔ ۱۸ اگست کو جنرل پلو کچھ لوگوں کے ہمراہ اندر بُلایا گیا اور امام سے مذاکرات شروع ہو گئے۔ امام شاملؒ کی یہ شرط تھی کہ وہ بدستُور اپنے علاقے میں موجود رہیں گے اور یہ کہ جمال الدین کو جمالہ نمبر دار کی تحویل میں دے دیا جائے گا۔ جنرل پلو واپس آ گیا لیکن مذاکرات مزید تین روز تک جاری رہے۔ اسی دوران یہ بات واضح ہو گئی کہ امامؒ نے ہتھیار ڈالنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ چنانچہ ۱۲ اگست کو روسی حملہ پھر شروع ہو گیا۔ تیسری بار پھر انھیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ مریدین اپنی روایتی بے جگری سے اس طرح لڑے کہ رُوسیوں کو منہ کی کھانا پڑی۔ مریدین کی تمام پوزیشنیں حسبِ سابق محفوظ تھیں۔

اگلی صبح جب حملہ دوبارہ شروع ہُوا تو روسیوں کی حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ انھیں کسی مزاحمت

کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ فصیل جہاں انھیں شدید ترین نقصان پہنچا تھا بالکل خالی پڑی تھی۔ رُوسی افواج اخالگو میں داخل ہو گئیں اور کچھ ہی دیر میں اخالگو کا ایک بڑا حصہ ان کے قبضے میں تھا۔ گاؤں میں انھیں چند افراد نظر آئے۔ باقی لوگ وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

شدید مقابلہ:

اب ایک اور لڑائی شروع ہو گئی۔ مریدین کی عورتوں تک نے شدید مقابلہ کیا۔ ایسے واقعات بھی پیش آئے کہ نہتی عورتوں نے اپنے آپ کو رُوسی سنگینوں کی قطاروں کے سامنے پھینک دیا۔ اسی دوران پُرانے اخالگو پر حملہ شروع کر دیا گیا۔ رُوسیوں کا ایک کالم چپکے سے پرانے اخالگو تک پہنچ چکا تھا اور توپوں نے بھی گولہ باری شروع کر دی اور اچانک حملے کی وجہ سے پُرانے اخالگو پر جلد ہی قبضہ کر لیا گیا۔ ان دو دنوں میں لڑائی کے دوران رُوسیوں کے ۱۶ افسر اور ۱۴۶ سپاہی ہلاک اور ۱۵ افسر اور ۴۸۰ سپاہی زخمی ہوئے۔ اگرچہ اخالگو پر قبضہ ہو چکا تھا لیکن لڑائی ایک ہفتہ تک جاری رہی۔ ہر گھر، ہر غار، ہر جگہ سنگینوں کی مدد سے خالی ہوئی۔ گو مجاہدین کو ناقابلِ برداشت نقصان اُٹھانا پڑا تھا پھر بھی مرتے دم تک انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ کسی شخص نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ عورتوں اور بچوں تک نے جس عزم کے ساتھ مقابلہ کیا وہ تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نقش رہے گا۔ ہاتھوں میں خنجر یا پتھر لیے وہ رُوسی سنگینوں پر ٹُوٹ پڑے اور مرتے دم تک مقابلہ کیا۔ کئی لوگوں نے نہتے ہونے کی وجہ سے چٹانوں سے چھلانگیں لگا دیں تاکہ وہ قیدی نہ بن سکیں۔ ماؤں نے اپنے بچوں کو اپنے ہاتھوں سے ختم کر دیا کہ وہ کہیں دشمن کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ پورے کے پُورے خاندان اپنے گھروں کے ملبے تلے دب گئے۔ کچھ مریدین نے زخموں سے نڈھال ہونے پر یُوں ظاہر کیا جیسے وہ ہتھیار ڈال رہے ہیں۔ جُونہی کوئی روسی سپاہی نزدیک آیا انھوں نے اسے ختم کر دیا۔ کئی رُوسی اس طرح ہلاک ہوئے۔ تقریباً ۹ سو قیدی رُوسیوں کے ہاتھ آئے جن میں سے زیادہ تر عورتیں، بچے اور بوڑھے تھے۔ ان میں سے بھی اکثریّت زخمی اور نڈھال تھی۔ اس کے باوجود بھی کئی لوگوں نے بے جگری کا مظاہرہ کیا۔ کئی افراد نے اپنی بچی کھچی ہمت جمع کر کے محافظوں کے ہاتھوں سے

سنگینیں چھین کر ان پر حملہ کر دیا۔ وہ قید کی نسبت شہادت کو کہیں زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔
۲۹ اگست ۱۸۳۸ء تک اخالگو میں ایک متنفس بھی باقی نہیں تھا۔

## رُوسیوں کے مجموعی نُقصانات:

یہ محاصرہ ۸۰ دن تک جاری رہا اور اس دوران میں رُوسیوں کے ۲۵ افسر اور ۴۸۷ سپاہی ہلاک اور ۱۲۴ افسر اور ۲۲۹۲ سپاہی زخمی ہُوئے۔ تقریباً ۳ ہزار کی اس تعداد کے علاوہ بیماری کی وجہ سے بھی انھیں بھاری نقصان اُٹھانا پڑا۔

## ایک مُعمّا:

یہ خونیں ڈرامہ ختم ہو گیا۔ پردے کھینچ دیے گئے۔ ڈرامے کے کردار سٹیج کے پیچھے چلے گئے مگر مرکزی کردار امام شاملؒ کا کیا بنا؟ وہ اس ڈرامے کے اختتام پر سٹیج پر موجود نہیں تھے۔ یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ رُوسیوں نے امامؒ کو ڈھونڈنے کے لیے زمین آسمان ایک کر دیا ہو گا۔ انھوں نے ہر گوشہ چھان مارا۔ ہر گھر، ہر غار، ہر کونے کُھدرے میں تلاش کیا۔ ہر لاش کو دیکھا لیکن نہ تو وہ زندہ یا مردہ مل سکے اور نہ ہی ان کے بارے میں باقی بچ جانے والوں سے اطلاع مل سکی کہ وہ کہاں گئے۔ انھیں زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ یہ مُعمّا رُوسیوں کے لیے لاینحل تھا۔ کیا انھوں نے اپنی بہن فاطمہ اور دُوسرے بہت سے لوگوں کی طرح چٹان سے چھلانگ لگا دی تھی یا سات سال پہلے والے غمری کے معرکے کی طرح یہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے؟ کچھ دنوں تک اس سلسلے میں کوئی واضح بات سامنے نہیں آ سکی اور جب یہ حقیقت معلوم بھی ہوئی تو بہت کم لوگوں کو اس کا یقین آ سکا۔

یوں معلوم ہوتا ہے ۲۱ اگست کی رات کو جب امامؒ کو یہ یقین ہو گیا کہ اب بچاؤ کی کوئی صُورت باقی نہیں رہی تو وہ اپنی بیوی، ایک بچے اور چند انتہائی قریبی ساتھیوں کے ہمراہ یہاں سے نکل گئے اور اُوپر چٹانوں میں جا کر پناہ لے لی۔ (اس محاصرے میں ان کی ایک بیوی شہید ہو چکی تھیں) دُوسری رات یہ مختصر سی جماعت دریا کے کنارے پہنچی۔ وہاں انھوں نے کچھ لکڑیوں کو جمع کر کے ایک کشتی بنائی اور اس پر مصنوعی انسانی ڈھانچے بنا کر رُوسیوں کی توجہ

ہٹانے کے لیے دریا میں بہا دیے۔ یہ کوشش کامیاب رہی۔ کشتی پر ہر طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ اس کارروائی کی آڑ میں آہستہ آہستہ رینگتے اور دریا کے نچلے حصے سے ہوتے ہوئے وہ ایک پہاڑی نالے کے قریب آ نکلے لیکن غلطی سے ایک رُوسی مورچے سے ان کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ یہاں لڑائی کے دوران امام شاملؒ کا چھوٹا بیٹا (جو ماں کی کمر کے ساتھ بندھا ہُوا تھا) زخمی ہوگیا دُوسری طرف رُوسی لیفٹیننٹ مارا گیا۔

امامؒ یہاں سے تیزی سے نکلے اور بڑی عُجلت میں درّہ عبُور کیا اور پہاڑ کی دُوسری جانب اُترے۔ اشیلتا کے پُل کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے۔ وہ اس کے نزدیک ہی جا نکلے۔ یہاں دریا پر بہت بڑی بڑی چٹانیں ہیں اور ان کے نیچے سے جھاگ اُڑاتا ہُوا دریا گذرتا ہے۔ انھوں نے ان چٹانوں پر لکڑی کے شہتیر رکھے اور ان کی مدد سے دریا عبُور کیا۔ ابھی وہ کچھ ہی آگے گئے ہوں گے کہ انھیں غمری کی طرف سے ایک پارٹی آتی ہُوئی نظر آئی۔ یہ لوگ الو بیگ کی طرف سے بھیجے گئے تھے تاکہ وہ پُل کی نگرانی کرسکیں۔ یہاں ان پر کئی فائر ہوئے لیکن امام شاملؒ محفوظ رہے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے رُوسیوں کا ساتھ دیا تھا اور ملک کے غدار تھے۔ امام شاملؒ نے ان غداروں کی طرف حقارت آمیز انداز سے دیکھا اور چیلنج دے کر کہا: ''غمری والو! فکر نہیں۔ ہم دوبارہ ملیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے چٹانوں سے اُترے اور نظروں سے غائب ہوگئے۔

رُوسیوں کی غلط فہمی:

ایک بار اور رُوسی کامیاب ہوگئے۔ ایک بار اور سینٹ پیٹرز برگ کے حکمرانوں نے امام شاملؒ کی شکست اور اپنی کامیابی پر ایک دُوسرے کو مُبارک باد دی، تمغے بانٹے گئے۔ شراب کے دور چلے۔ چھلکتے ہوئے جاموں اور موسیقی کی دُھنوں پر جام صحت تجویز ہوئے۔ مریدیت کے اختتام پر گھی کے چراغ جلائے گئے۔ رُوس کی سرحدوں پر منڈلاتے ہوئے خطرے کے بادل چھٹ گئے تھے۔ لیکن کس کو معلوم تھا کہ ابر کا آخری ٹکڑا جو کہ اُفق کے اُس پار چھپ گیا ہے، اپنے جلو میں کتنے طوفان لیے ہوئے ہے۔ رُوس کے احمق حکمرانوں کو کیا علم تھا کہ وہ آخری ٹکڑا

جسے وہ نظر انداز کر بیٹھے تھے جب اُٹھے گا تو ان کی آنے والی نسلوں سے خُون آلود لاشوں کے کتنے ہی نذرانے وصول کرے گا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ ان کی اولاد میں سے کتنے ہی سپوت امام شاملؒ اور ان کے ساتھیوں کو زیر کرنے کی ناکام کوشش میں داغستان کے پہاڑوں میں دم توڑ دیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ امامؒ اگر بچ بھی نکلے تو ان کی حیثیت ایک بے گھر مُسافر کی سی ہو گی یا ایک مفرور شخص کی جو قانون کے ہاتھ سے محفوظ رہنے کے لیے جنگلوں اور پہاڑوں کے غاروں میں اپنی زندگی کے باقی ماندہ ایام گزار دے گا۔

ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ امام شاملؒ ایک بہت بڑی مسلح جمعیت کے سربراہ بن چکے تھے۔ تین سال بعد وہ رُوسی فاتحین کو عبرت نائک شکست دے چکے تھے اور مزید ایک سال بعد تمام شمالی داغستان امام کے قدموں میں آ چکا تھا۔ ہر رُوسی قلعہ محصُور تھا یا برباد کیا جا چکا تھا اور مریدیت جنگلوں اور پہاڑوں میں سمور سے لے کر تریک تک، قفقاز سے لے کر کیپین کے ساحلوں تک پھیل چکی تھی۔

**باب پنجم:**

# ۱۸۳۹ ـــــ ۱۸۴۲ء

کاؤنٹ گریب اپنی کوششوں کے نتائج سے اس درجہ مطمئن تھا کہ اس نے امام شاملؒ کے بچ نکلنے کی کچھ زیادہ پروا نہیں کی۔ ان کے سر کی قیمت اس وقت صرف تین سو روبل مقرر کی گئی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کاؤنٹ کو ان سے زیادہ اندیشے نہیں تھے۔ ہمیں شہنشاہ نکولائی کی ذہانت کی داد دینی پڑتی ہے۔ وہ اپنے مشیروں اور وزیروں سے کہیں زیادہ دُور اندیش تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس نے جنرل گریب کی رپورٹ کے حاشیے پر لکھا:

''بہت خوب! لیکن افسوس ہے کہ شامل بچ نکلا۔ مجھے اس کی جانب سے مزید سازشوں کا خطرہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا اثر ورسوخ اور اس کے وسائل ختم ہو چکے ہیں لیکن پھر بھی ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اب کیا ہوگا؟''

جنرل گولون نے کرنل پلو کے نام نومبر ۱۸۳۸ء کو ایک خط لکھا:

''اس خطرناک شخص نے ہمیں جو نقصان پہنچایا ہے اس کی وجہ سے ہمیں ہر ممکن ذریعے سے اسے ختم کرانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ کوہستانی علاقے میں کئی بہادُر افراد ہمارا ساتھ دینے کو تیار ہو جائیں گے۔ میری اس ضمن میں یہ ہدایت ہے کہ تم خُفیہ طور پر کچھ با اعتماد اور بہادر لوگوں کے سامنے یہ تجویز رکھو اور انھیں شامل کے سر کے معاوضے میں تین ہزار روبل تک کی پیش کش کرو۔ کامیابی کی صورت میں یہ رقم تمھیں فوراً بھجوا دی جائے گی۔''

اس خط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ ہی عرصے بعد رُوسیوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ امام کے سر کے لیے بیش قیمت انعام کی پیش کش کرنے پر مجبور ہو گئے۔

۱۸۳۹ـ۱۸۴۰ء کے موسمِ سرما کے دوران چیچنیا کی صورت حال رُوسیوں کے لیے خاصی

خوش کُن تھی۔ جنرل گریب جس حد تک پُر اُمید تھا وہ حالات کو دیکھتے ہُوئے تعجب خیز نہ تھا۔ اس کے احکامات پر جنرل پلو دسمبر اور جنوری میں چیچنیا کے زیریں علاقوں سے گزرا اور کسی بھی جگہ اسے مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے برعکس یوں محسوس ہوتا تھا کہ چیچنیا کے لوگ رُوسی طاقت سے مرعُوب ہو گئے ہیں۔ انھوں نے تمام شرائط بلا عذر تسلیم کر لیں۔ مفرور امراء کو رُوسیوں کے سپرد کر دیا۔ چند رُوسی قیدیوں کو بھی واپس کر دیا۔ کافی تعداد میں روسیوں سے چھینی ہوئی بندوقیں بھی واپس کر دی گئیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ تمام علاقہ رُوسیوں کے زیرِ نگیں آنے کا منتظر تھا۔ رُوسی حکومت کے مقرر کردہ پولیس افسر اپنے ظلم وستم کی وجہ سے بدنام تھے لیکن اس کے باوجود جب یہ مسئلہ پیش آیا کہ اس علاقے میں رُوسی پولیس افسروں کا تقرر کیا جائے تو لوگوں نے اسے قبول کر لیا۔ جنرل گریب نے اس تبدیلی کو اخالگو میں رُوسی کامیابی کا رہینِ منت قرار دیا اور گولووِن اور وزیرِ جنگ کو رپورٹ پیش کی کہ علاقے میں مکمل طور پر امن بحال ہُو چُکا ہے۔ اس نے لکھا:

> "اگرچہ ہمیں امام شامل کو گرفتار کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی لیکن اس کے تمام پیروکاروں کی گرفتاری، اس کے اپنے فرار اور قبائل کو عبرت ناک سبق کی وجہ سے اس کے اثر ورُسوخ کو اتنا دھچکا پہنچا ہے کہ پہاڑوں میں جگہ جگہ خوار ہوتے رہنے اور اپنے خورد ونوش کے انتظامات کرنے کے علاوہ وہ شاید ہی کسی اور طرف متوجّہ ہو سکے۔"

۱۸۴۰ء کی مہمات کے بارے میں منصوبہ بندی کرتے ہُوئے وہ مزید لکھتا ہے:

> "داغستان اور چیچنیا کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر اس بات کا غالب امکان ہے کہ ہماری مہم کو کسی جگہ بھی مقابلہ پیش نہیں آئے گا۔ ترکی کے قلعے کے لیے بھی ہمیں شاید ہی لڑنے کی ضرورت پڑے۔ چیچنیا میں کسی قسم کی بے اطمینانی، بدامنی یا بغاوت کا اندیشہ نہیں۔"

رُوسیوں کا ارادہ تھا کہ ترکی اور غرزل میں قلعے تعمیر کیے جائیں۔ اب جنرل گریب نے

داتا برزوئی کے مقام پر بھی، جہاں دریائے ارغون سب سے نچلے کٹاو داخل ہوتا ہے، ایک قلعے کی تعمیر کا حکم دے دیا۔اس طرح چیچنیا کی اگلی دفاعی لائن مکمل ہو جاتی تھی۔ بعد میں صرف ایک قلعہ تعمیر ہوسکا اور وہ غرزل گاؤں میں تھا۔

## چیچنیا کی جدوجہد آزادی:

بہار ابھی شروع نہیں ہوئی تھی کہ ایک بار پھر چیچنیا کے بہادر عوام اُٹھ کھڑے ہوئے۔ رُوسی ایک بار پھر امام شاملؒ کے داؤ میں آ گئے۔اس طرح کہ شاید خود امامؒ کو بھی اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا تھا۔ جنرل پلو انتہائی سفاک قسم کا شخص تھا۔قفقاز میں ظلم وستم کیا کچھ مفہوم رکھتا تھا اس کا اندازہ پچھلے صفحات کے مطالعہ سے ہو چکا ہوگا۔ سفاک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ مصلحت نا اندیش بھی تھا۔ چیچنیا کے لوگ اس سے خائف بھی تھے اور حد درجہ نفرت بھی کرتے تھے۔ جب کوتوال کے عُہدے کے لیے اسے مقامی زبان جاننے والے افراد نہ مل سکے تو اس نے مقامی غنڈوں کو اس عُہدے پر فائز کر دیا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ یہ اوباش لوگ عوام کی عزت و حرمت کے درپے ہوگئے عوام کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا۔ بے اطمینانی پھیل گئی اور جب یہ افواہ پھیلی کہ چیچنیا کے عوام سے اسلحہ چھین لیا جائے گا اور ان سے رُوسی کسانوں کی طرح بیگار لی جائے گی تو عوام میں بغاوت کی چنگاریاں پھر سُلگ اُٹھیں۔ ہوا کا ایک جھونکا بھی اس آگ کو شعلۂ جوالہ بنا سکتا تھا اور رُوسی استعمار اس آگ میں جل کر بھسم ہوسکتا تھا۔ ہوا کا یہ جھونکا کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔لوگوں کو ایک رہنما کی ضرورت تھی اور امام شاملؒ ان کی رہنمائی کے لیے آن موجود ہُوئے۔

امامؒ کو اخالگو سے نکلے ہُوئے ٦ ماہ گزر چکے تھے لیکن اس عرصے میں حالات خاصے بدل گئے تھے۔ شعیب ملا اور جبوت خان نے، جو کہ امام شاملؒ کی طرح آور قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، امامؒ کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ تحریک مریدیت کے سب بڑے بڑے لیڈر اسی قبیلے سے متعلق تھے۔ امامؒ چیچنیا کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں قیام پذیر ہوگئے۔ جوہر قابل کہاں چھپ سکتا ہے! ہیرے کی چمک فقیر کی گدڑی اور تاج میں یکساں طور پر موجود رہتی ہے۔ ان

کے علم وفضل اور شجاعت وتقدیس کی داستانیں جلد ہی دُور دُور پھیل گئیں۔ گردوپیش کے عوام ان کے گرد اکٹھا ہونے لگے اور جاں نثاروں کا حلقہ روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ لوگ ان سے رہنمائی لینے کے لیے آیا کرتے۔ اپنے معاملات اور مقدمات کے فیصلے کے لیے ان سے فتوے طلب کرتے۔ جگہ جگہ سے وفود آ رہے تھے کہ وہ حکمرانی قبول کریں۔ داغستان میں انھوں نے آخوردی ماہومًا کا تقرر کر دیا اور چیچنیا کی قیادت اس شرط پر قبول کر لی کہ ان کے احکامات کی مکمل تعمیل کی جائے گی۔ وہ قریہ قریہ شریعت کی اشاعت کے لیے دورے کرنے لگے۔ مارچ کے وسط تک عوام مسلح ہو چکے تھے اور جنرل پلو کی فوجوں اور امام شاملؒ کے گروہوں کے درمیان تصادم بھی ہو چکا تھا۔ گروزنی سے کچھ فاصلے پر مونجہ کے قریب، چیچنیا کے لوگوں کو اگرچہ شکست کھانا پڑی لیکن آزادی کی جدوجہد شروع ہو چکی تھی۔

ایک دو ماہ کے رُوسی استبداد نے عوام کی آنکھیں کھول دی تھیں اور بحیرۂ اسود کے ساحل پر رُوسیوں کی پے در پے شکستوں نے ان کے حوصلے اور بلند کر دیے تھے۔ ۱۸۴۰ء [1] کے اواخر تک جنگ آزادی خاصی شدید ہو چکی تھی اور کچھ ہی عرصے میں نہ صرف چیچنیا بلکہ داغستان کا بھی ایک بڑا علاقہ اس کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ یہ تحریک آزادی پہلے سے کہیں زیادہ شدید تھی۔

## گوریلا جنگ:

امام شاملؒ جو اس سے پہلے پہاڑوں میں اپنے جوہر دکھا چکے تھے، اب جنگلوں میں جہاد کر رہے تھے۔ رُوسیوں کو اس سے پہلے بھی جنگلوں کا خاصا تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ زار کی منظم افواج سے جم کر مقابلہ کرنے کی بجائے مجاہدین گوریلا جنگ کے حربے استعمال کر رہے تھے۔ انھوں نے جس کامیابی سے یہ جنگ شروع کی اسے اختتام تک پہنچایا اور رُوسیوں کو بھاری جانی اور مالی نقصان پہنچائے نیز جس جنگی مہارت سے ان تمام حملوں کو منظم کیا انھیں دیکھتے ہوئے اگر میں امام کو عالمِ اسلام کا پہلا گوریلا لیڈر کہوں تو بات غلط نہ ہو گی۔ وہ اگر آج اس جگہ پر ہیں تو کل انہیں کسی اور اور مقام پر جہاد میں مصروف پایا جاتا۔ وہ بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ لپکتے،

[1] بحیرۂ اسود کے ساحل پر مقامی قبائل نے روسیوں کے کئی قلعوں پر قبضہ کر لیا تھا۔

دشمن پر کاری ضرب لگاتے اور پھر جنگلوں میں غائب ہو جاتے۔

امامؒ نے اپنی کارروائیوں کو اصول جنگ کی کسی کتاب کی صُورت میں تحریر نہیں کیا اور اگر کیا بھی ہو تو وہ ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے گوریلا جنگ کے اصولوں کو جس طرح عملی طور پر میدان جنگ میں استعمال کیا، آج تک شاید ہی ان میں کوئی اضافہ کیا جا سکا ہو۔ موجودہ دور میں چی گویرا کی مشہور کتاب ''گوریلا جنگ'' میں جن اصولوں کو تحریر کیا گیا ہے، امام شاملؒ ان اصولوں کی شہادت آج سے ڈیڑھ صدی پہلے، دے چکے تھے۔ چی گویرا ایک جگہ لکھتا ہے:

''دشمن پر کاری ضرب لگا کر فوراً پسپا ہو جانا چاہیے۔ انتظار کیا جائے۔ گھات لگائی جائے۔ دوبارہ حملہ کیا جائے اور پھر فوراً پسپا ہوا جائے۔ بار بار یہی عمل دہرایا جانا چاہیے اور دشمن کو ایک لمحے کے لیے بھی چین سے نہیں بیٹھنے دینا چاہیے۔''
(گوریلا جنگ صفحہ ۱۸)

''یہ ضربیں مسلسل ہونی چاہئیں۔ دشمن کو علاقۂ جنگ میں سونے کی مُہلت بھی نہیں دینی چاہیے اس کی تمام کمین گاہوں کو برباد کر دینا چاہیے۔ اور اسے یہ تاثر دینا چاہیے کہ وہ ہر طرف سے گھر چکا ہے۔ جنگلوں اور اُونچی نیچی جگہوں میں یہ کارروائیاں دن رات جاری رہنا چاہئیں۔'' (گوریلا جنگ صفحہ ۲۱)

بولیویا اور کیوبا کے جنگلوں اور پہاڑوں میں چی گویرا نے جو اُصول وضع کیے تھے امامؒ انھی اصولوں کے عملی خالق ہیں۔ انھوں نے اپنی تعلیم کسی ملٹری اکیڈمی میں نہیں بلکہ میدان جنگ میں حاصل کی تھی اور انھیں ہم بجا طور پر اس میدان میں PIONEER یا پیش رو کہہ سکتے ہیں۔

رُوسیوں کے حلیف کاسک گاؤں ہوں یا صلح پسند چیچنیا کے دیہات سب یکساں طور پر ان کا نشانہ بنتے۔ وہ مسلمان جو ان کے ساتھ جہاد میں شریک نہیں ہو رہے تھے اور وہ کافر جنھوں نے مسلمانوں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی، یکساں طور پر امام کے غیظ وغضب کا نشانہ بن

رہے تھے۔ وہ چوبیں گھنٹے میں پچاس ساٹھ میل دُور کسی بھی جگہ کو نشانہ بنا کر واپس پلٹ سکنے کے قابل تھے۔

عالمی فوجی تاریخ میں اس نوع کی برق رفتاری اور دلیرانہ حملوں کی مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔ موجودہ دور میں گوریلا جنگ کے جو اصول وضع کیے گئے ہیں اگر ہم ان کی عملی تشریح کہیں دیکھنا چاہیں تو یہ جنگیں ایک عمدہ مثال کی حیثیت رکھتی ہیں۔

چی گویرا، جس کا حوالہ پہلے آ چکا ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے:

"گوریلا دستے کی بنیادی خصوصیت اس کا مُتحرک ہونا ہے۔ چند منٹوں میں ایک خاص جگہ سے ہٹ کر کسی دوسرے میدان میں یا بوقت ضرورت چند گھنٹوں میں اس علاقے سے ہٹ کر کسی دُوسرے علاقے میں پہنچ جانا اور پھر دشمن کو اپنے مقام سے لاعلم رکھتے ہوئے گھیرے میں آ جانے سے بچنے کی کوشش کرنا انتہائی ضروری ہے۔" (گوریلا جنگ صفحہ ۲۳)

امامؒ کے نائبین نے ان کے بنیادی طریق جنگ کو استعمال کرتے ہُوئے داغستان کی مشرقی سرحدوں اور مغرب میں قفقاز کے علاقوں تک رُوسیوں کو ایک ایسی تھکا دینے والی جنگ میں اُلجھائے رکھا جو ان کے لیے خاصی اعصاب شکن ثابت ہوئی۔ جنرل گریب کو پہلے پہل اپنے اندازوں کے غلط ثابت ہونے کا یقین نہیں آیا۔ وہ سٹورو پول میں مقیم رہا اور اس نے کرنل پلو کو اس کی اپنی حماقتوں اور ظلم و تشدد کے نتائج بھگتنے کے لیے اس کے اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ کچھ عرصہ بعد پلو کی جگہ جنرل گالافیف نے لے لی۔ لیکن اس اثنا میں صورت حال خاصی بگڑ چکی تھی۔ دائیں بازو کی تمام تر افواج ان حالات کا مُقابلہ کرنے کے لیے میدانِ جنگ میں اُتر آئی تھیں اور جلد ہی گریب کو کمان اپنے ہاتھ میں لینا پڑی۔

آخوردی ماہوماؒ:

ان حالات میں آخوردی ماہوماؒ کی شخصیت اُبھر کر سامنے آئی۔ وہ اس سے پہلے بھی امام شاملؒ کے نائب کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے۔ انھوں نے امامؒ کی ہدایات اور طریق

جنگ پر عمل کرتے ہُوئے نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ گوریلا جنگ کے حربے رُوسیوں کی طاقت کو کمزور سے کمزور تر کر رہے تھے۔ مجاہدین نے مغربی بازو پر دُور دُور تک حملے کیے اور مزدوک تک پر ایک زوردار حملہ کیا۔ یہاں انھیں نمایاں کامیابی حاصل نہ ہوسکی تاہم انھیں یہاں سے کچھ قیدی ہاتھ آئے جنھوں نے بعد میں امامؒ کے ہاتھوں اسلام قبول کرلیا اگرچہ کچھ مقامات پر مرید افواج کو شکست کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس تمام سال کی جنگوں کے نتائج بہت بڑی حد تک امامؒ ہی کے حق میں رہے اور ان کامیابیوں نے مستقل قریب کی شاندار کامیابیوں کے لیے بہت بڑی حد تک راہ ہموار کردی۔

۱۸۴۰ء میں امام شاملؒ نے چیچنیا میں تحریک کو مضبوط بنا کر داغستان میں مُہمات کی ابتدا کی اور یہاں ہزاروں مسلمان امامؒ کے جھنڈے تلے آ گئے۔ جنرل کلنگو اور اس کے دُوسرے افسر اشکارتی کے مقام پر ایک بار پھر امامؒ سے زور آزمائی کر رہے تھے۔ یہاں سے کلنگو بڑی مشکل سے جا۱۰۱ بچا کر نکل سکا۔ امامؒ یہاں سے نامعلوم وجُوہات کی بنا پر سولاک واپس پلٹ گئے جب کہ پورا شمالی داغستان ان کے رحم وکرم پر تھا۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ انھوں نے ایسا سُنہری موقع کیوں ہاتھ سے جانے دیا۔

۱۴ ستمبر کو جنرل کلنگو ایک بڑی فوج کے ساتھ غمری کی طرف بڑھا اور اچانک حملہ کر کے پہلے اور تیسرے امام کی اس جائے ولادت کو قبضے میں لے لیا۔ امام شاملؒ کے لیے یہ خاصا المناک واقعہ تھا اور وقتی طور پر اس سے ان کی تحریک بھی متاثر ہوئی لیکن نومبر میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کے نتائج نے امام شاملؒ کی تمام شکستوں کا بدلہ چکا دیا۔

حاجی مراد:

حاجی مراد جنھوں نے ہمزاد کو آور کے شہزادوں کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے شہید کر دیا تھا، رُوسیوں سے وفاداری کا دم بھرتے رہے تھے اور کچھ عرصہ کے لیے وہ ان کی فوج میں بھی باقاعدہ طور پر رہ چکے تھے۔ ان کے اثر و رسُوخ ہی کی وجہ سے امامؒ کو خونزاخ میں نمایاں کامیابی حاصل نہ ہوسکی تھی۔ جنرل کلنگو اسی وجہ سے حاجی مراد کا خاصا شکرگزار تھا اور ان کی بہت قدر

کرتا تھا۔ ایک عرصے سے حاجی مراد اور احمد خان کے درمیان دشمنی چلی آرہی تھی۔ احمد خان کو جب آویریا کی حکومت دے دی گئی تو اس نے حاجی مراد پر کاری ضرب لگانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے حاجی مراد پر یہ الزام لگایا کہ انھوں نے امام شاملؒ کے ساتھ ساز باز کر رکھی ہے اور رُوسی کمانڈر سے شکایت کر کے انھیں گرفتار کروادیا۔ جنرل کلنگو کو اسی اثنا میں میجر لازاروف سے بھی اس قسم کی اطلاعات ملیں۔ احمد خان ہی نے میجر لازاروف کو اس بارے میں کہا ہوگا۔ جنرل کلنگو نے حاجی مراد کو حفاظتی گارڈ کی ہمراہی میں شورا بھجوانے کے احکامات جاری کر دیے اور یہ بھی حکم دیا کہ اگر کسی جگہ مزاحمت پیش آئے یا انھیں رہا کروانے کی کوشش کی جائے تو ان کو فوراً قتل کر دیا جائے۔

۱۰ نومبر کو حاجی مراد، جنھیں اس سے پہلے ۱۰ روز تک ایک توپ کے ساتھ زنجیروں سے باندھے رکھا گیا تھا، خونزاخ سے روانہ کر دیے گئے۔ حفاظتی گارڈ میں ایک افسر اور ۴۵ سپاہی شامل تھے۔ پہاڑوں پر خاصی برف پڑی تھی۔ چونکہ سڑک سے جانا مشکل تھا اس لیے ایک طویل راستہ اختیار کیا گیا۔ بوتسرو گاؤں کے قریب راستہ اس قدر تنگ تھا کہ حاجی مراد اور حفاظتی گارڈ کے سپاہی ایک قطار ہی میں چل سکتے تھے۔ ۴۵ افراد کی موجودگی میں حاجی مراد کا بھاگ نکلنا ایک معجزے سے کم نہ تھا، پھر بھی حفاظتی انتظامات کی خاطر ان کو ایک رسے سے باندھ دیا گیا جس کے سرے آگے پیچھے دو آدمیوں کے ہاتھ میں تھے۔ ایک تنگ جگہ پر حاجی مراد نے اُچھل کر دونوں آدمیوں سے رسہ چُھڑا لیا اور ڈھلان سے چھلانگ لگا دی۔ کسی اور موسم میں حاجی مراد کے پرخچے اُڑ جاتے لیکن انھوں نے برف پر چھلانگ لگائی تھی اور انھیں یقین تھا کہ وہ محفوظ رہیں گے اور یہی ہوا۔ اگرچہ انہیں چوٹیں آئیں اور ان کی ایک ٹانگ بھی ٹُوٹ گئی لیکن وہ بھیڑوں کے ایک قریبی فارم تک رینگتے رینگتے پہنچ گئے۔ یہاں سے ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہُوا۔

ان پر امامؒ کی معاونت کا الزام لگایا گیا تھا۔ انھوں نے اس الزام کو نہ صرف دُرست ثابت کیا بلکہ امامؒ کی اس بھرپور انداز سے مدد کی کہ مشرقی قفقاز میں ان کے نام سے رُوسیوں

کے دل دہلتے تھے۔

## امامؒ کا اثر ورسوخ:

امام شاملؒ نے اپنے مُتحرک دستوں کو وقتی طور پر اپنے اپنے علاقوں میں بھجوا دیا اور دُوسری طرف رُوسیوں نے بھی چھاؤنیوں میں پناہ لے لی۔ سال کا آخری حصہ نسبتاً خاصا پُر امن گزرا۔ رُوسی افواج اگرچہ میدان جنگ میں وقتی طور پر کامیاب رہی تھیں لیکن چیچنیا میں رُوسی اثرات قریب قریب ختم ہو چکے تھے اور دُوسری طرف امام شاملؒ جو ایک سال پہلے صرف سات ساتھیوں کے ہمراہ چیچنیا میں داخل ہُوئے تھے، چیچنیا کے بہادر عوام کی قیادت کر رہے تھے۔ ان کی حکومت کا دائرہ داغستان سے لے کر قفقاز تک پھیل چکا تھا۔

۱۸۴۱ء کے سال کے لیے گولوون کے منصوبے میں ترکی گاؤں کے بالمقابل سولاک میں قلعہ بنانا، شورا کے حفاظتی انتظامات کا استحکام، نیزو کے مقام پر قلعے کی تعمیر اور خونزاخ کے قلعے کی تعمیر نو شامل تھی۔ داغستان میں بارہ ہزار افراد پر مشتمل ایک فوج ان کاموں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے پہلے ہی سے موجود تھی۔

چیچنیا میں بھی ایک خاصی بڑی فوج نے ہر طرف لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ وہ بستیوں کو نذرِ آتش کر رہی تھی اور تلوار کے زور سے دیہاتوں کو مسخر کر رہی تھی۔ داتا بورزوئی کے مقام پر بھی قلعہ بنانے کا پروگرام تھا۔ شمالی قفقاز میں جنرل گولوون کی کمان میں چودھویں [1] پیادہ ڈویژن کی ۱۶ بٹالین بھی دے دی گئیں اور شہنشاہ نے یہ اُمید ظاہر کی اتنی بڑی تعداد میں افواج کی وجہ سے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوں گے۔ بعد کے واقعات نے شہنشاہ کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا ہوگا کیونکہ شاذ ہی ایسا ہُوا کہ کسی خوش خبری کی اطلاع اسے ملی ہو۔

اس میں شک نہیں کہ ترکی پر روسی افواج نے قبضہ کر لیا تھا۔ منصُوبے کے مُطابق یہاں قلعہ بھی بنا لیا گیا اور چیچنیا کو بھی روند ڈالا گیا۔ لیکن آٹھ ماہ کی ان جنگوں کے بعد جب رُوسی افواج موسمِ سرما گزارنے کے لیے چھاؤنیوں میں واپس پہنچیں تو امامؒ کی پوزیشن پہلے سے کہیں

---

[1] ایک ڈویژن کی عام تعداد پندرہ سے بیس ہزار کے لگ بھگ ہوتی ہے۔

زیادہ مضبوط تھی اور رُوسیوں کو پہلے سے بدر جہا زیادہ خطرات درپیش تھے۔ داغستان میں حاجی مراد کے بچ نکلنے کے اثرات رُوسیوں کے حق میں کچھ اچھے ثابت نہ ہُوئے۔ اس بہادُر رہنما نے ٹانگ ٹھیک ہوتے ہی داغستان میں خونزاخ کے قریب سلمس کے مقام پر اپنی پوزیشن کو خاصا مستحکم بنا لیا۔ امام شاملؒ نے انھیں اپنا نائب مُقرر کر دیا تھا اور انھوں نے اپنی تمام تر قوتیں تحریک کی کامیابی کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔ اس انتہا درجے کے باصلاحیت نائب نے تھوڑے ہی عرصے میں یہ ثابت کر دیا کہ امامؒ نے ان پر جس اعتماد کا اظہار کیا تھا وہ بے جا نہ تھا۔ انھوں نے صحیح معنوں میں نیابت کا حق ادا کیا۔

ان کی وجہ سے مریدیت کی تحریک ان کے اپنے قبیلے آور میں بے حد مقبول ہو رہی تھی۔ ۱۸۴۱ء میں کلنگو نے حاجی مرادؒ کو اپنے دائرہ اثر میں واپس لانے کی ناکام کوششوں کے بعد ان کے خلاف سخت اقدامات کا فیصلہ کیا۔ تقریباً ۲ ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج نے (جس میں سے نصف تعداد ملیشیا کی تھی) خونزاخ سے سلمس کا رُخ کیا۔ اس کی قیادت شاہی توپ خانے کا سربراہ جنرل بکونن کر رہا تھا۔ جنرل بکونن قفقاز کے دورے پر آیا ہُوا تھا۔ اس نے اس خیال سے کہ اس مہم کو اس کی قیادت سے فائدہ پہنچے گا اس کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ گاؤں پر حملہ کیا گیا۔ صرف ایک بُرج ایسا رہ گیا تھا جس پر قبضہ نہیں کیا جا سکا اور اس کی مزاحمت اس قدر شدید تھی کہ رُوسیوں کو بھاری نقصان اُٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔ اس جنگ میں جنرل بکونن مارا گیا اور رُوسیوں کی ایک تہائی نفری بھی اس معرکے کی نذر ہوئی۔ حاجی مرادؒ کے والد اور ان کے دو بھائی شہید ہو گئے اور وہ خود بھی زخمی ہوئے۔

۲ جولائی ۱۸۴۱ء کو گولودن اس نتیجے پر پہنچا کہ رُوسیوں کو آج تک قفقاز میں امام شاملؒ سے زیادہ خطرناک شخص سے پالا نہیں پڑا۔ پے در پے شکستوں کی وجہ سے رُوسی ہائی کمان میں شدید اختلاف پیدا ہو چکے تھے اور رُوسی سپاہیوں کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ اسی اثنا میں امام شاملؒ نے قاضی قوموخ پر حملہ کر کے حکمران خاندان، روسی ریذیڈنٹ اور اس کے حفاظتی دستے کو قید کر لیا۔

جنرل گریب ۱۸۴۱ء کے اواخر میں پیٹرز برگ پہنچا اور شہنشاہ سے یہ مُطالبہ منوانے میں کامیاب ہو گیا کہ شمالی داغستان اور بائیں بازو کی تمام افواج کو جنرل گولو ون کی کمان کی بجائے اس کی کمان میں دے دیا جائے۔ وہ خاصی تیاریوں کے بعد ۱۰ ہزار سے زیادہ فوج اور ۲۴ توپیں لے کر چیچنیا کی مہم پر نکلا۔ اس کا ارادہ تھا کہ سب سے پہلے امام شاملؒ کی رہائش گاہ دارگو پر حملہ کیا جائے اور اسے تباہ کر کے چیچنیا اور شمالی داغستان کے درمیانی سلسلۂ کوہ کو عبور کر کے گمبیت اور آندی کو بھی مطیع کیا جائے۔ اس مہم کے لیے اس نے اتنی بڑی فوج اکٹھی کی تھی مگر تعداد کی اس زیادتی سے فوج کی کارکردگی کو خاصا دھچکا لگا۔

دارگو کی مہم:

فوجی ساز و سامان لے جانے کے لیے تقریباً ۳ ہزار گھوڑے فراہم کیے گئے تھے۔ اسی طرح خاصی بڑی تعداد میں چھکڑے بھی فوج کے ہمراہ تھے۔ نیز کئی میل تک پھیلے ہُوئے سامان کی وجہ سے بڑی تعداد میں محافظ دستوں کی ضرورت تھی۔ آدھی نفری تو اس کی حفاظت ہی کے لیے چاہیے تھی اور یہ تعداد بھی محض واجبی سی حفاظت ہی کر سکتی تھی۔ دو بٹالین اگلے حصے کی حفاظت کے لیے اور تقریباً اتنی ہی تعداد کالم کے عقب میں ضروری تھی۔ باقی ماندہ فوج کو حفاظتی دستوں کی شکل دے دینے کی وجہ سے تمام فوج کی دفاعی صورتحال مجموعی طور پر خاصی کمزور تھی۔ دُوسری مشکلات اس پر مستزاد تھیں۔ جنگلوں میں اتنی بڑی فوج کا کامیابی سے رستہ طے کرنا ہی ایک بڑی بات تھی کُجا یہ کہ کوئی کامیاب حملہ یا جنگی تیاری کی جا سکتی۔ مجاہدین کو ایک سُنہری موقع ہاتھ لگا تھا اور وہ اس صورتحال سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھا سکتے تھے۔ بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ مجاہدین دُشمن کی ہر جنگی غلطی پر اسے بھاری تاوان دینے پر مجبُور کر سکتے تھے۔ مریدین کو معلوم تھا کہ وہ جنگل عبور کرتے وقت اس کالم پر کامیاب حملہ کر سکتے ہیں۔ یہاں سے باہر نکلنے پر اسے نقصان پہنچانا مشکل ہو جائے گا۔ آیئے اب زار کی اس فوج کی حالت زار کا جائزہ لیں۔

۳۰ مئی ۱۸۴۲ء کو یہ کالم صرف ۵ میل بڑھ سکا تھا۔ حالانکہ مجاہدین کی طرف سے قطعی طور

پر کوئی مزاحمت پیش نہیں آئی تھی۔ تمام رات بارش برستی رہی تھی جس کے باعث راستے بے حد خراب ہو چکے تھے۔ آگے بڑھنا اتنا دشوار ہو گیا تھا کہ ۳۱ مئی کی شام تک پندرہ گھنٹے کے مسلسل سفر کے باوجود مزید آٹھ میل کا سفر کیا جا سکا تھا۔ تمام رات جنگ جاری رہی اور رات کو مجبوراً ایک ایسی جگہ قیام کرنا پڑا جہاں پانی کا دُور دُور تک نام و نشان نہ تھا۔

اگلے روز مجاہدین کی تعداد میں گو کہ اضافہ ہو چکا تھا، پھر بھی ان کی کل تعداد ۲ ہزار سے زیادہ نہ تھی جب کہ رُوسی کالم ۱۰ ہزار سے مُتجاوز تھا۔ امام شامل کے مریدین کی بہت بڑی تعداد ان کے ہمراہ قاضی قاموخ ہی میں تھی۔ دُوسرے دن بھی رُوسی فوج کو کافی مُشکلات کا سامنا کرنا پڑا حتیٰ کہ پانی تک نہ مل سکا۔ اس کے کئی سو افراد زخمی تھے اور ہر لمحہ گھبراہٹ اور پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

تین دن میں اس کالم نے صرف ۲۱ میل کا سفر طے کیا تھا اور جنرل گریب کو اب محسُوس ہو رہا تھا کہ پیش قدمی جاری رکھنا قریباً ناممکن ہے۔ پہلی جُون کو اس نے اپنی پیش قدمی کو روکنے اور اس سڑک سے واپسی کے احکامات دیے۔ پیش قدمی کی مشکلات بجا سہی لیکن پسپائی اس سے بھی زیادہ پُر خطر ثابت ہوئی۔

جب سپاہیوں کو یہ پتہ چلا کہ ان کی پیش قدمی ناکام ہو گئی ہے تو ان کے حوصلے اور پست ہو گئے۔ اس سے پہلے وہ ان مشکلات کو کسی نہ کسی طرح گوارا کیے جا رہے تھے لیکن ناکامی کے احساس نے ان میں بددلی پیدا کر دی۔ کوئی سپاہی بھی مناسب جگہ لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ حال یہ تھا کہ کالم کے دفاعی انتظامات کے لیے جو احکامات صادر کیے گئے تھے ان کی طرف کوئی توجہّ دینے کے لیے آمادہ نہ ہُوا۔ پسپائی کی وجہ سے ہر وہ بھاری چیز جس سے سفر میں دشواری پیش آ رہی تھی، تباہ کر دینے کے احکامات دیے گئے نتیجتاً اور زیادہ بددلی پھیلی زخمیوں اور توپوں کو بچانے کے لیے باقی ماندہ بوجھ سے نجات حاصل کرنا ضروری تھا۔ اس صُورت حال کی وجہ سے یُوں محسُوس ہوتا تھا جیسے عظیم شکست کا سامنا کرنا پڑ رہا ہو۔ اب کے بددلی بُزدلی کی حد تک بڑھ گئی تھی اور حال یہ تھا کہ پُوری کی پوری بٹالینیں محض کُتوں کے بھونکنے کی وجہ سے راہِ فرار اختیار

کر لیتیں۔ ان حالات میں جانی نقصان اور بھی بڑھ گیا تھا۔

یہ تصویر کا صحیح رُخ تھا۔ اس میں کسی قسم کی رنگ آمیزی نہیں کی گئی۔ دراصل حالات ہی اتنے خراب تھے کہ ان میں مبالغے یا جھوٹ کی گنجائش ہی موجود نہیں۔ مجاہدین کا طریقِ جنگ اس قدر عُمدہ تھا کہ رُوسیوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ بالائی چیچنیا میں مقیم نائب شعیب مولاؒ نے مریدین کو حکم دیا کہ وہ بڑے بڑے بیچ کے درختوں پر قبضہ کر کے وہاں مورچے بنالیں۔ یہ درخت اتنے بڑے تھے کہ ان پر تیس چالیس افراد بیٹھ سکتے تھے اور یہاں سے رُوسیوں پر آسانی سے فائرنگ کی جا سکتی تھی۔ یہ دفاعی مورچے اتنے مضبوط تھے کہ پوری پوری رُوسی بٹالینوں کو انھیں توڑنے میں ناکامی ہُوئی۔ آخر کار یہ کالم ۴ جون ۱۸۴۷ء کو غرزل کے گاؤں میں واپس پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس تمام سفر میں ۶۶ افسر اور ۷۰۰ سے زیادہ سپاہی مارے گئے یا زخمی ہُوئے۔ دیگر تمام ساز و سامان تباہ ہو گیا۔

جنرل گریب کو اس واقعے سے عبرت حاصل نہیں ہوئی۔ اس بار اس نے داغستان پر فوج کشی کی ٹھانی۔ اس فوج کشی کے ذریعے اگالی پر قبضہ کر لیا گیا لیکن مریدین اسے پہلے ہی جلا کر جا چکے تھے۔ جنرل گریب کو اس ناکام مہم کے دوران ۱۱۱ افسروں اور ۲۷۵ سپاہیوں کی مزید قربانی دینی پڑی۔ اگالی سے رات کے وقت واپسی میں بھی انھی حالات سے سابقہ پڑا جو پچھلی مہم میں جنرل گریب کے کالم کی تباہی کا مُوجب ہوئے تھے۔ اس بار مریدین کی تعداد، جنھوں نے اس مہم کی تباہی میں حصہ لیا کسی طرح ۳۰۰ سے زائد نہ تھی۔

۱۸۳۹۔۱۸۴۲ء کے دوران جنرل گریب کی کمان میں رُوسیوں کے نقصانات یہ تھے۔ ۱۶۴ افسر اور ۷۵۶۱ سپاہی ہلاک اور ۳۷۲ افسر اور ۶۲۰۴ سپاہی زخمی۔ اس کے باوجود کچھ بھی تو حاصل نہیں ہو سکا۔ اُنیسویں اور اکیسویں ڈویژن کی تمام رجمنٹوں میں ایک کمانڈنگ افسر بھی زندہ نہیں بچ سکا تھا۔ ۱۸۴۲ء میں حالت یہ تھی کہ رجمنٹوں کی کل تعداد نصف سے بھی کم رہ گئی تھی۔

## باب ششم:

# امام شاملؒ کی کامیاب مُہمات

۱۸۴۳ء کے موسم سرما تک امامؒ نے فیصلہ کُن فوج کشی کی تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔انھوں نے ایک مستقل فوج کے مرکز کی بنیاد بھی رکھ دی تھی۔اس علاقے کی مخصوص صُورتحال کو سامنے رکھتے ہُوئے شاید اس سے بہتر فوجی تنظیم کا ڈھانچہ تیار نہیں ہو سکتا تھا۔امامؒ نے مسلح سواروں کے ایسے دستے تیار کیے تھے جن کا نام مرتھکؑ تھا۔ ہر دس گھروں میں سے ایک دستے کا انتخاب کیا جاتا تھا جس کا یہ فرض ہوتا کہ وقت پڑنے پر اشارہ ملتے ہی تیار ہو کر پہنچ جائے۔اس فوجی خدمت کے بدلے میں ان لوگوں کے گھوڑوں کا دانہ پانی، ان کی فصلوں کی کٹائی، زمین کی تیاری اور دوسرے گھریلو کام دیگر گھرانوں کے سُپرد ہوتے۔ یہ درحقیقت ان کی فوجی خدمت کا مُعاوضہ تھا۔ان لوگوں کے فرائض اور ان کو دی گئی مراعات ان کے ذوقِ جہاد کے عین مُطابق تھیں۔

مرتھک سواروں کو دس، سو اور پانچ سو کے مختلف گروپوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر گروپ کی قیادت اس گروپ کی اہمیت اور تعداد کے مُطابق ایسے افسر کے سُپرد کی جاتی جو اس کا اہل ہوتا۔سپاہیوں کو زرد اور افسروں کو سیاہ رنگ کے چوغے [1] دیے جاتے تھے۔ایک سو اور پانچ سو کے گروپوں کے افسر اپنی وردیوں پر تمغے بھی لگاتے تھے۔پانچ سو کے گروپ کا افسر عام طور پر نائب ہوتا۔ یہ نائبین دیگر مریدوں میں خاصی ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ان تمام لڑائیوں میں جو امام شاملؒ اور رُوسیوں کے درمیان ہُوئیں، کوئی نائب رُوسیوں کے ہاتھوں گرفتار نہیں ہو سکا۔ایک معرکے میں کسی رُوسی افسر کو نائب کے گرفتار کرنے پر جُرأت کا تمغہ دیا گیا تھا لیکن بعد

---

[1] یہ چوغے خاصے لمبے ہوتے تھے اور ان کی دونوں جانب کارتوسوں کے لیے پٹیاں لگی ہوتی تھیں۔ یہ قفقاز کے لوگوں کا منفرد لباس تھا۔

میں مزید تحقیق پر یہ بات غلط ثابت ہوئی ان نائبین کی قیادت کا نتیجہ تھا کہ دُور دراز علاقوں کے عوام تحریک مریدیت کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا دینے کے لیے تیار رہتے تھے۔ نُمایاں کارکردگی کے لیے دوسرے نشانات اور تمغے [1] بھی عطا کیے جاتے تھے آخوردی ماہوما کے پاس، جو نائب اوّل تھے، ایک تلوار تھی جس پر یہ عبارت تحریر تھی:

''تیز ترین تلوار، بہادر ترین انسان۔''

مرتھک سواروں کو بوقت ضرورت ہر گھر سے ایک ایک فرد مزید دے دیا جاتا۔ یہ لوگ عارضی عُہدے داروں کے زیر کمان ہوتے اور ان کی تنظیم بھی پہلے کی طرح ہی ہوتی۔ اسی طرح شدید ہنگامی صُورتحال میں بستیوں اور علاقوں کے تمام ہتھیار اُٹھانے کے قابل افراد کو بلا لیا جاتا تھا۔ فدائین کے گروہ کو ہر ماہ دو بوری آٹا دیا جاتا اور وہ لوگ جو جنگ میں کسی طرح کی بزدلی یا کم ہمتی کے مرتکب ہُوئے ہوں، کسی طرح موت سے بچ نکلتے تو ان کی پُشت پر تانبا داغ دیا جاتا تھا تاکہ لوگ ان بُزدلوں کو پہچان لیں۔ امامؒ شریعت کے احکامات کے معاملے میں خاصے سخت واقع ہوئے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح ان کے ہاتھ میں کوڑا ہوتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ صدیوں کی جاہلانہ رسُوم کو قوانین کی سختی سے پابندی کروائے بغیر نہیں مٹایا جا سکتا تھا۔ امامؒ کی یہ پالیسی خاصی کامیاب رہی اور لوگوں کی بگڑی ہوئی عادات کچھ ہی عرصے میں رُو بہ اصلاح ہو گئیں۔

رُوسی افواج کی حالت ان علاقوں میں خاصی خراب تھی۔ قلعے بنانے، بیرکیں تعمیر کرنے، ایندھن کاٹ کر لانے اور چارہ مہیا کرنے کا کام ان کی دوسری عام فوجی ذمہ داریوں کے علاوہ ہوتا۔ پھر یہی نہیں، خراب موسم میں انھیں ناقص خوراک ملتی اور رسد کی کمی کے اثرات بھی ان کو برداشت کرنے پڑتے۔ اپنے گھروں سے دُور، دشمن کے رحم و کرم پر پڑے ہُوئے ان سپاہیوں کی زندگی اس قدر تلخ تھی کہ بھگوڑے سپاہیوں کی تعداد میں اضافہ تعجب خیز معلوم نہیں ہوتا۔ ان

---

[1] امام شامل کا کہنا تھا کہ ان تمغوں کا نمونہ سلطان ترکی نے انھیں بھجوایا تھا۔ یہ تمغے امام شاملؒ کی طرف سے عطا کیے جاتے تھے۔

تمام مہمات میں جو داغستان اور چیچنیا کے علاقوں میں جاری رہیں، ہمیں جگہ جگہ بھگوڑوں کا ذکر ملتا ہے۔ اسی صُورت حال کا نتیجہ تھا کہ ایک مؤرخ کے بقول ہمزاد بیگ کا حفاظتی دستہ انہیں روسی بھگوڑوں پر مشتمل تھا۔

امامؒ کے گوریلا دستے:

امام شاملؒ کے فوجی نظام کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہ جب چاہتے اپنی فوج کو جمع کر سکتے تھے اور جب چاہتے انھیں واپس بھجوا سکتے تھے۔ انتہائی قلیل وقت میں وہ بڑی سے بڑی فوج کو جمع کر سکتے تھے۔ اس دور میں ہمیں اس فوجی حکمت عملی کی مثال نہیں ملتی۔ حقیقت یہ ہے کہ گوریلا جنگ کے جو اصول انھوں نے اپنے اس جہاد میں برتے، وہی بیسویں صدی میں چی گویرا اور ماؤزے تنگ کے افکار کی صُورت میں دنیا کے سامنے آئے ہیں۔ امامؒ نے اگرچہ اپنے ان اُصولوں کو کہیں باضابطہ طور پر مدوّن نہیں کیا لیکن ان تمام مہمات کا حال پڑھنے سے یہ واضح طور پر سامنے آ جاتے ہیں۔ ان اصولوں کی پیشِ نظر اس ایٹمی دور میں بھی کسی ایسی جگہ جنگ لڑی جاسکتی ہے جہاں کے جغرافیائی حالات داغستان اور چیچنیا سے مشابہ ہوں۔ امامؒ نے ولیم کے مرکزی مقام سے دشمن کو شمال اور جنوب ہر جگہ پریشان کر رکھا تھا۔ ان کے مرتھک دستے ہر وقت مُتحرک رہتے تھے۔ امامؒ جب چاہتے اپنے ان گوریلوں کو واپس گھروں میں بھیج دیتے اور پھر جہاں چاہتے انھیں یُوں جمع کر لیتے جیسے ان کے پاس جادُو کی چھڑی ہو۔ یہ سوار دستے بلا کے مُتحرک تھے۔ انھیں کسی لمبے چوڑے ساز و سامان اور رسد کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ ہر شخص اپنا ضروری سامان خود ہی اُٹھاتا تھا۔ یہ دستے رُوسیوں کو ایسی ایسی جگہ پہنچ کر زک پہنچاتے جہاں رُوسیوں کو وہم و گمان بھی نہ ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ رُوسی افواج ہر جگہ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتی تھیں دورِ حاضر کے فوجی نظام میں آپ انھیں گوریلا دستوں کا نام دے سکتے ہیں اور شاید اس سے بہتر کسی اور اصطلاح سے ان کی تنظیم اور جنگی حکمت عملی کو نہیں سمجھایا جا سکتا۔ ایک کامیاب گوریلا جنگ لڑنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، امامؒ نے اپنے دستوں کو ان سے پوری طرح مسلح کیا ہوا تھا۔ چی گویرا لکھتا ہے:

''ایک گوریلے سپاہی کو ہر قسم کی دُشواریوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اسے غذا، پانی، کپڑا اور سر چھپانے کی جگہ سے بوقت ضرورت کافی دیر تک بے نیاز رہنے کے قابل ہونا چاہیے۔ یہ صورت حال اس جنگ میں اکثر و بیشتر آتی ہے کہ ان میں سے ایک یا دو یا سبھی چیزیں ناپید ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں بیماری اور زخموں کو برداشت کرنے کی قوت بھی ہونی چاہیے کیونکہ اکثر اوقات اسے کسی سرجن کے علاج کے بغیر ہی وقت گزارنا پڑے گا۔''

(گوریلا جنگ ص ۴۸)

مریدین کی زندگی اس طرح تھی کہ انھیں دن رات ایسی ہی صورت حال سے سابقہ پیش آتا تھا اور وہ ان تمام مشکلات کو برداشت کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ ایک رُوسی مؤرخ لکھتا ہے کہ وہ بہت کم کھاتے اور بہت کم سوتے ہیں۔ وہ کئی دن گھوڑے پر سوار رہ سکتے ہیں اور سخت سے سخت حالات میں بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔ جس جگہ سے حاجی مرادؒ نے چھلانگ لگائی تھی، وہیں سے ایک رُوسی گارڈ بھی گرا تھا لیکن وہ گرتے ہی مر گیا جب کہ حاجی مرادؒ زندہ بچ نکلے تھے۔ نہ صرف مرید بلکہ خود امامؒ انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ بعد میں جب انھیں رُوسیوں کے یہاں نظر بند رہنا پڑا اور انھیں مختلف آسائشیں بہم پہنچائی گئیں تب بھی انھوں نے اپنا رہن سہن اور خورد و نوش کا انداز نہیں بدلا۔

مریدین کے ان طوفانی دستوں میں بلا کی پھرتی پائی جاتی تھی۔ وہ راتوں رات دُور دراز کے علاقوں پر حملہ کر کے اپنے مقام پر واپس پہنچ سکتے تھے۔ ان کے اکثر حملے شب خون کی صورت میں ہوتے تھے۔ چی گویرا ''گوریلا جنگ'' میں رقم طراز ہے:

''گوریلا سپاہی شب خون مارنے میں طاق ہوتا ہے۔ اس نوع کی جنگ کے لیے جس قسم کی صفات درکار ہیں وہ سب اس میں پائی جاتی ہیں۔ اسے پہاڑوں اور میدانوں میں سے ہوتے ہُوئے حملے کے مقام تک کامیابی سے پہنچنے کے قابل ہونا چاہیے اور دشمن پر اچانک ٹوٹ پڑنا چاہیے۔ دشمن کو بے خبری کے عالم میں جا

پکڑنا گوریلا جنگ کی ایک بہت بڑی خصوصیت ہے۔"

("گوریلا جنگ" صفحہ ۴۸)

مریدین کی جنگوں میں جگہ جگہ ہمیں ایسے واقعات ملتے ہیں جو اس اقتباس کی عملی تشریح نظر آتے ہیں۔ رُوسی افواج کے کمانڈر اپنی بہترین سراغ رسانی کے باوجود مریدین کے مقام اجتماع کا اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں ایک خاص جگہ کا سُراغ ملتا تو اگلی ہی شب وہ اس جگہ سے ۷۰ یا ۸۰ میل کی دور کسی اور جگہ پر شب خون مار کر نا معلوم مقامات میں روپوش ہو جاتے۔ پھر وہ رُوسیوں پر ہمیشہ اس وقت حملہ آور ہوتے جب کہ وہ کالم کی شکل میں سفر کر رہے ہوتے اور انھیں بُری طرح نقصانات پہنچاتے۔ چی گویرا لکھتا ہے:

"خندقوں میں موجود دشمن گوریلا سپاہیوں کا نشانہ نہیں ہوتا۔ وہ یہ پسند کرتا ہے کہ دشمن کالم کی صورت میں مارچ کر رہا ہو اور اسے ہر لمحے اس بات کا دھڑکا لگا ہوا ہو کہ ابھی اس پر حملہ ہُوا۔" (گوریلا جنگ صفحہ ۵۴)

اکاّ دُکاّ فوجی پوسٹیں اور مورچے بھی جہاں بیرونی مدد نہ پہنچ سکے، اس کا نشانہ بنتے ہیں۔

## امامؒ ایک کامیاب کمانڈر:

امامؒ ایک کامیاب فوجی لیڈر کی طرح دشمن کی تمام کمزوریوں کا علم رکھتے تھے۔ انھوں نے اس کی کمزوریوں کا پُورا پورا فائدہ اُٹھاتے ہُوئے ان کو تہس نہس کر دیا۔ رُوسی افواج داغستان میں چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ غیر محفوظ اور دفاعی اعتبار سے کمزور قلعوں میں مُنقسم یہ افواج داغستان میں ایک دوسرے سے فاصلوں پر ہونے کی وجہ سے امامؒ کے گوریلا دستوں کا بڑی آسانی سے نشانہ بن سکتی تھیں اور انھوں نے دشمن کی اس کمزوری کو بھانپ لیا تھا۔

انھوں نے اپنی تمام فوجی مُہموں کی منصوبہ بندی اور ان کے بارے میں مکمل اطلاعات اس ہُنر مندی سے اکٹھی کی تھیں کہ موجودہ دور میں شاید کئی سٹاف افسروں کی مدد سے کوئی چیف آف سٹاف بھی اتنی اچھی منصوبہ بندی نہیں کر سکتا۔ امام شاملؒ کے مُقابلے میں رُوسی سٹاف افسروں کی ایک بڑی تعداد کمانڈر انچیف اور چیف آف سٹاف کی قیادت میں جنگی سکیموں کو

مرتّب کرنے کا کام انجام دے رہی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے باضابطہ طور پر جنگی امور کی تربیت لی تھی۔ جنھوں نے کتنی ہی جنگوں میں حصہ لیا تھا۔ ان میں سے کتنے ہی ایسے تھے جن کے سینوں پر تمغوں کی کئی کئی قطاریں آویزاں تھیں اور جو بے شمار سازوسامان، توپ خانہ، رسالہ اور پیادہ فوج کی مدد سے داغستان کے قلعے سے اپنا سر نصف صدی سے پھوڑ رہے تھے۔

دُوسری طرف داغستان کے مجاہدین تھے جن کے پاس نہ توپ خانہ تھا اور نہ بہتر قسم کا دوسرا اسلحہ۔ جن کے پاس نہ سازوسامان کی کثرت تھی اور نہ گولہ بارود کی۔ وہ فوجی اکیڈمیوں کے تربیت یافتہ نہ تھے۔ انھوں نے آپریشن روم میں بیٹھ کر جنگی نقشوں کی مدد سے لڑائیوں کی منصوبہ بندی نہیں کی تھی۔ نہ انھیں زارِ رُوس کی فوجوں میں رہ کر جنگوں کا وسیع تجربہ تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے زار کی فوجوں کا ایک طویل عرصے تک ناطقہ بند کیے رکھا۔ رُوس کی تمام تر توقعات ان پہاڑوں کے ساتھ سر ٹکراتی رہیں لیکن اسے لاشوں اور زخمیوں کے انبار کے سوا کچھ حاصل نہ ہو سکا۔

## امامؒ کی باکمال شخصیّت:

مریدین کی کامیابی کے دوسرے اسباب کے علاوہ ایک بہت بڑا سبب امامؒ کی باکمال و باصلاحیت شخصیت اور قیادت تھی جس نے داغستان کے رہنے والوں کو اتنی نمایاں کامیابیوں کے حصُول میں مدد دی۔ امامؒ کے مدِ مقابل جنرل کلنگو تھا۔ یہ وہی جنرل ہے جو اس سے پہلے بھی امامؒ اور ان کے خلاف کئی معرکوں میں رُوسی افواج کی قیادت کر چکا تھا۔ لیکن وہ امامؒ اور ان کے مریدین کی صلاحیتوں کے بارے میں صحیح اندازہ نہ لگا سکا۔

اس سلسلے میں ایک واقعے کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ۱۶ اگست ۱۸۴۳ء کو کلنگو نے رُوسی ہیڈکوارٹر کو یہ رپورٹ بھیجی کہ مریدین کی قوت کا قلع قمع کیا جا چُکا ہے اور امن وامان بحال ہو چکا ہے۔ اس رپورٹ کے ۱۱ دن بعد امامؒ ویلیم سے ایک بڑی فوج کے ہمراہ پیش قدمی کرتے ہوئی بڑھے اور چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ۵۰ میل دُور انتوکول کے پاس پہنچ گئے۔ جہاں اسی دن تلیتی سے کبیت ماہوما اور اوریا سے حاجی مرادؒ اپنے اپنے لشکروں سمیت اُن سے آملے۔

اب مجاہدین کی کل تعداد ۱۰ ہزار کے لگ بھگ پہنچ گئی تھی۔ پہاڑی علاقوں میں اتنا لمبا سفر اتنی مختصر مدّت میں طے کر لینا، مشترکہ افواج کا ایک ہی جگہ ایک ہی وقت میں پہنچ جانا اور پھر یہ حقیقت کہ یہ سب کچھ عین کلنگو کی موجودگی میں انجام پایا، امامؒ کی اعلیٰ درجے کی جنگی مہارت کا ثبوت ہے جس کے سبب ان کو دنیا کے بہترین کمانڈروں کی صف میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اُونچے درجے کے گوریلا لیڈر جیسے الفاظ امام کا مقام متعین نہیں کر سکتے۔ وہ ان سے بلند و بالا چیز تھے۔ یہ کہنا مُبالغہ نہ ہوگا کہ دُنیا کی فوجی تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

رُوسی سپاہیوں کی بہادری اور اُن کے افسروں کی ذہانت میں کوئی کلام نہیں۔ وہ انتہائی بے جگری سے لڑے۔ ان کے جرنیل میدانِ جنگ سے دُور نقشوں کا مُطالعہ کرنے کے عادی نہیں تھے۔ ان میں سے کئی دادِ شجاعت دیتے ہُوئے مارے گئے تھے۔ ان کے کردار اور بہادری کے بارے میں کوئی غلط قسم کا فقرہ چست نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بلا شُبہ زار کے بہترین سپاہیوں میں سے تھے۔ اس کے باوجود امامؒ کے مُقابلے میں ان کی حیثیت بونوں کی ہے۔ وہ امامؒ کی گرد کو بھی نہیں پا سکے۔ پھر ایک آدھ نہیں بلکہ درجن بھر جرنیلوں اور فوجی کمانڈروں نے ان کے ساتھ پنجہ آزمائی کی۔ بہترین حربی صلاحیتوں کے مالک افراد ان کے مقابلے میں اترے مگر امامؒ نے سب کو ایک ایک کر کے پچھاڑا۔ کتنے ہی مواقع پر امامؒ کے بچنے کی اُمید تک نہ رہی تھی۔ ان کے ساتھیوں میں سے سب کے سب شہید ہو گئے تھے اور رُوسیوں کے بقول ان کی تحریک کا سر کچل دیا گیا تھا، رُوسی افواجِ قاہرہ داغستان کے گوشے گوشے کو آگ اور خُون میں نہلا چکی تھیں، ان کی بربریت کے سیاہ کارناموں نے لوگوں کے دلوں پر دہشت بٹھا رکھی تھی۔ پھر وہی لوگ جو ابتدا میں رُوسی توپ خانے کے چند گولوں کی وجہ سے اپنے لاؤ لشکر سمیت بھاگ نکلا کرتے تھے، روسی توپخانے کے جنرل کو ہلاک کر چکے تھے اور توپ خانے کی دن رات گولہ باری کے باوجود شکست تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔ یہ امامؒ کی مقناطیسی شخصیت اور پُر ہمت ذات ہی کا کمال تھا کہ انھوں نے داغستانیوں کو رُوس کی عظیم طاقت کے مقابلے میں لا کھڑا کیا تھا۔ آپ ان تمام واقعات کی کوئی تاریخی توجیہہ پیش نہیں کر سکتے۔ اس کے تجزیے کی

لاکھ کوشش کریں۔ آپ اس صورتِ حال کو سمجھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ امامؒ ایک شعلۂ جوالہ تھے جوزار کی افواج کو جلا کر بھسم کر چکا تھا۔ ہر جرنیل اپنی شکستوں کے زخم چاٹتا رہ جاتا اور ہر نیا کمانڈر اپنے تمام اندازوں کو غلط سمجھنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

## انتوکول کی تسخیر:

انتوکول کے باشندوں نے امامؒ کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کی تھی۔ انھوں نے ان کے ۸۷ مریدین کو پچھلے سال رُوسی کمانڈر کے حوالے کر دیا تھا اور اپنے گاؤں میں رُوسی چھاؤنی قائم کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ ان لوگوں کو یہ جتانا کہ وہ امام سے بغاوت کر کے سُکھ کا سانس نہیں لے سکتے، خاصا اہم کام تھا۔ چنانچہ امامؒ نے ان لوگوں کو ان کی بغاوت کی سزا دینے اور چھاؤنی کو تباہ کرنے کا منصُوبہ بنایا اور انھوں نے یہ کام بڑی کامیابی سے انجام دیے۔

جب کرنل ویسلسکی کو غمری میں امامؒ کی پیش قدمی کا پتہ چلا تو وہ ہدایات کا انتظار کیے بغیر انتوکول کو بچانے کے لیے چل پڑا۔ راستے میں میجر گرابوسکی تانیخ کی چھاؤنی سے فوج سمیت شامل ہو گیا۔ خراچی سے دو مزید کمپنیاں اس کے ساتھ ہولیں اور ۵۰۰ افراد کی مشترکہ فوج اور دو توپوں کے ہمراہ ویسلسکی انتوکول کی جانب روانہ ہو گیا۔ ۲۹ اگست کی صبح اس نے گاؤں کے اُوپر بلند پہاڑ پر توپیں نصب کر دیں اور خود نیچے باغات میں اُتر آیا۔ یہاں اسے شدید نقصان اُٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔ اسی اثنا میں وہ گھیرے میں آ چکا تھا اور مریدین اس کی توپوں پر بھی قبضہ کر چکے تھے۔

رُوسیوں کی باقی ماندہ فوج نے گھیرے سے نکلنے کی کوشش کی لیکن انھیں سخت افراتفری میں دریا کے کنارے کی طرف بھاگنا پڑا۔ ویسلسکی قید ہو گیا اور ۱۱ دُوسرے افسر اور ۴۷ سپاہی ہلاک ہو گئے۔ تمام فوج میں سے صرف چند افراد دریا عبُور کر کے اپنی جان بچا سکے۔ جنرل کلنگو نے وڈوکیموف کو اس غرض سے بھیجا تھا کہ وہ باقی ماندہ افواج کے ساتھ مل کر حملہ کر سکے لیکن اس جلد بازی کی وجہ سے یہ کام نہ ہو سکا اور وہ دُور کھڑا رُوسی افواج کو حسرت و یاس سے دیکھتا رہا۔ دو دن بعد رُوسی قلعے نے ہتھیار پھینک دیے۔ امام شاملؒ نے قلعے کے مضبوط دفاع کی قیادت

کرنے پر لیفٹیننٹ انسوف کو بطورِ عزّت افزائی اس کی تلوار واپس کر دی۔ انھوں نے گاؤں پر بھی دھاوا بول کر اس پر قبضہ کر لیا تھا۔

## جنرل کلنگو کی گلو خلاصی:

جنرل کلنگو اسی اثناء میں تانخ پہنچ چکا تھا اور اس کے پاس ۱۱۰۰ کے قریب سپاہی موجود تھے، لیکن اس وقت روسیوں کو اپنی حماقتوں کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ہُوا یوں کہ خراچی کے اہم مقام پر میجر کوسووچ کو جس کے پاس ۲۱۰ باقاعدہ فوج اور ملیشیا تھی، یہ ہدایات تھیں کہ وہ اس جگہ کو کسی قیمت پر نہ چھوڑے۔ لیکن امامؒ کی آمد کا سنتے ہی میجر موصُوف نے راہِ فرار اختیار کی اور بالا خانی میں جا کر پناہ لی۔ اس نے امامؒ کے حملے تک کا انتظار نہیں کیا۔ خراچی پر دوبارہ قبضہ کرنے کی ناکام لیکن پُر ہمت کوشش کے نتیجے میں رُوسیوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ میجر زینوف، ۸ دوسرے افسر اور ۱۱۰ سپاہی ہلاک ہو گئے۔ تین افسر اور ۶۸ سپاہی زخمی ہُوئے۔ اب جنرل کلنگو کا شورا سے رابطہ خطرے میں پڑ گیا۔ اس کے سامنے دو راستے تھے۔ یا تو بالا خانی جا کر ان لوگوں کو بچایا جاتا، یا دوسری صورت میں اویریا کی چھاؤنیوں کے دفاع کی کوئی صورت نکالی جاتی۔ جنرل کلنگو نے دوسری صورت اختیار کی اور خونزاخ روانہ ہو گیا۔ یہاں امامؒ نے اس کو گھیرے میں لے لیا۔ میجر جنرل پرنس دولگوروکوف بڑی مشکل سے جنوبی داغستان سے ہوتا ہُوا یہاں پہنچا اور اپنے افسرِ اعلیٰ کلنگو کو اس محاصرے سے نجات دلائی۔ اب خونزاخ میں رُوسی متحدہ افواج کی تعداد چھ ہزار تک جا پہنچی تھی اور کلنگو محاصرے کی وجہ سے خاصا پریشان نہ ہوا ہوتا تو شاید اس فوج کی مدد سے امامؒ کے خلاف کوئی فوجی کارروائی کرنے میں کامیاب ہو جاتا لیکن اس نے اس ضمن میں کوئی اقدام نہیں کیا۔

## رُوسی قلعوں کی تسخیر:

۲۵ دن کے مختصر عرصے میں (۲۷ اگست سے ۲۱ ستمبر ۱۸۴۳ء تک) امامؒ نے اویریا کے دارالخلافہ کے سوا روس کے تمام قلعوں کو فتح کر لیا تھا اور ۱۴ رُوسی توپیں بھی قبضے میں لے لی تھیں۔ اس کے علاوہ رُوسیوں کے اس مختصر مدّت میں ۶۵ افسر اور ۲ ہزار سپاہی ہلاک، قید یا

زخمی ہو چکے تھے۔ اخالچی کے قلعے کو کمانڈنگ افسر نے ایک فائر کیے بغیر حوالے کر دیا تھا۔ خراچی کے قلعے کی افواج اسے خالی کر کے پہلے ہی جا چکی تھیں۔ البتہ تانخ اور گوتسال میں امام کو اچھے خاصے مقابلے کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں کی افواج نے اپنے قلعوں کی حفاظت بڑی بہادری سے کی تھی۔

امامؒ نے حاجی مرادؒ کے اصرار کے باوجود خونزاخ پر حملہ نہیں کیا۔ انھیں معلوم تھا کہ یہاں حملے کے اثرات اچھے نہیں ہوں گے اور بھاری نقصان کے علاوہ پہلی کامیابیوں پر بھی پانی پھر جائے گا۔ رُوسی اویریا سے دُوسرے ذرائع سے بھی نکالے جا سکتے تھے۔ امامؒ جیسی جنگی بصیرت رکھنے والے شخص سے یہ بات پوشیدہ نہ تھی۔

جنرل گورکو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا اقدام کرے۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ شمال کی جانب سے زیادہ خطرہ ہے۔ وہ ۱۲۲ اکتوبر ۱۸۴۳ء کو شورا سے چل پڑا۔ دوسری طرف سے بائیں بازو کے کمانڈر جنرل فرئیگ کی آمد کی وجہ سے شمال کی طرف حملے کے امکانات کافی کم ہو گئے تھے اور یہ حصہ خاصی حد تک محفوظ ہو گیا تھا۔ امامؒ کا ارادہ اس جانب حملے کا ضرور تھا لیکن وہ اسی صورت میں حملہ کرتے کہ انھیں بہت زیادہ نقصان نہ اٹھانا پڑتا۔ بہر حال وہ اپنی اس کامیابی پر خوش تھے کہ انھوں نے گورکو کو شورا چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب غرغبیل اور پھر خونزاخ پر قبضہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ انھوں نے اندرونی لائن پر اپنی افواج کی مدد سے دشمن کو اس طرح زک پہنچائی کہ وہ کسی جگہ بھی اپنے دفاع کو مضبوط کرنے کے قابل نہ رہا۔ ایک بار پھر حالات اور واقعات نے امامؒ کی جنگی حکمت عملی کی برتری کو ثابت کر دیا تھا۔

۳۰ ر اکتوبر کو گورکو اس اطمینان کے ساتھ شورا واپس پہنچا کہ شمال کی جانب سے خطرہ ٹل گیا ہے لیکن راستے میں معلوم ہُوا کہ کبیت ماہوما نے غرغبیل پر چڑھائی کر دی ہے اور یہ قلعہ محصُور ہو چکا ہے۔ گورکو نے اپنی تمام افواج کو جمع کیا۔ ان کی تعداد ۱۶۰۰ تھی۔ لیکن ۶ نومبر کو جب وہ محصور قلعے سے کچھ فاصلے پر پہنچا تو اس معلوم ہُوا کہ محاصرے کو توڑنا آسان کام نہیں۔ بلندی سے اس نے اس مہم کے بارے میں چھان بین کرنا شروع کر دی اور اپنی جنگی کونسل سے مشورہ

کیا لیکن بالآخر اسے بامرِ مجبوری واپس جانا پڑا۔ ۸ نومبر کو اس قلعے کے افراد نے انتہائی بہادری سے لڑنے کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔ صرف دو افسر اور چند سپاہی زندہ بچ سکے تھے۔ رُوسیوں نے اس قلعے کا دفاع بڑی بہادری سے کیا۔ محصورین کو ایک بار اس وقت اُمید کی جھلک نظر آئی تھی جب انھوں نے رُوسی سنگینوں کو پہاڑوں پر چمکتے دیکھا تھا لیکن ان کی مایوسی کی انتہا نہ رہی جب انھیں پتہ چلا کہ ان کے ساتھی انھیں دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ کر پہاڑوں کے پار واپس چلے گئے ہیں۔ پھر بھی یہ بہادُر محصورین آخر دم تک لڑتے رہے۔

جس دن غرغیبل فتح ہُوا اسی روز جنرل لی گور کو نے پاسک کو خونزاخ خالی کرنے کے احکامات بھیج دیے۔ لیکن اسے یہ پیغام ۱۱ نومبر کو ملا۔ وقتی طور پر اس کی تعمیل مشکل تھی کیونکہ تانوس اور ارگنی اس وقت مجاہدین کے قبضے میں تھے۔ ۱۶ نومبر کو جب حاجی مرادؒ امام شاملؒ کی افواج کی مدد کے لیے گئے ہُوئے تھے، پاسک نے بڑی رازداری سے بالاخانی کے تنگ درے سے ہوتے ہوئے پسپائی اختیار کی۔ اس خطرناک راستے سے وہ تمام بیماروں، زخمیوں اور اسلحہ سمیت کامیابی سے گزر گیا اور دریا کے دائیں کنارے پر زیرینی قلعے میں پہنچ گیا لیکن مجاہدین نے اس کا محاصرہ کر لیا۔ بورووِنگ، کالی پر بھی اسی دن قبضہ ہو گیا تھا اور پاسک ایک مہینے تک اس طرح محصور رہا کہ قفقاز کی فوج میں اس محاصرے کی دُھوم مچ گئی تھی۔ یہاں محصورین کو خاصی سختیاں سہنی پڑی تھیں لیکن اس کے باوجُود وہ ثابت قدمی سے جمے رہے۔

اسی اثنا میں امامؒ کی فوج دریائے سولک عبور کر کے شاسخال کے علاقوں پر حملہ آور ہو چکی تھی۔ انھوں نے تارکو کے قریب پندرہ افراد کے حفاظتی دستے کو ہلاک کر دیا اور شوار کے قریب جا پہنچے۔ دوسرے دن غمری کے قلعے کی نفری بغیر احکامات کے واپس پلٹ آئی۔ یہ دانش مندانہ فعل تھا۔ بصُورت دیگر وہ یقینی طور پر ہلاک ہو جاتی۔ لیکن اسے کمانڈنگ آفیسر کی بزدلی پر محمول کیا جاتا رہا۔ ۱۱ دسمبر کو امام خود شورا سے ۱۰ میل کے فاصلے پر کازانیشچی کے مقام پر پہنچے اور ارد گرد کے تمام دیہات پر قبضہ کے بعد گور کو کو اس کے دارالحکومت میں گھیرے میں لے لیا۔ نیزو کا آٹھ روزہ محاصرہ شروع ہو چکا تھا اور غیونسکو کا قلعہ بھی مجاہدین کے گھیرے میں آ چکا تھا۔ ۱۷

دسمبر کو جب خونزاخ کی فوج زیریانی کے مقام پر محصور ہوگئی تو پورے شمالی داغستان میں تمام روسی سپاہی ان چار مقامات میں گھیرے میں آ چکے تھے۔

رُوسیوں کے لیے صُورت حال خاصی نازک ہوگئی تھی۔ نیز و کے مقام پر ۳۴۶ کے مقابلے میں ۶ ہزار مجاہدین تھے۔ زیریانی کے مقام پر پاسک کی فوج میں زخمیوں اور بیماروں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ اگر اس محاصرے کو توڑنے کی کوشش کی جاتی تو یہ سب لوگ مجاہدین کے رحم وکرم پر چھوڑنے پڑتے تھے اور شورا بھی طویل عرصے تک محاصرے کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

مختصر یہ کہ تمام شمالی داغستان میں رُوسی سپاہیوں کی زندگی سخت خطرے میں تھی۔ باہر کی مدد کے بغیر ان کی نجات ناممکن تھی اور صرف دو اطراف سے مدد پہنچ سکتی تھی۔ بائیں بازو کی جانب سے مدد مل سکتی تھی جہاں جنرل فرٹیگ کمان کر رہا تھا یا دوسری طرف جنوبی داغستان سے کسی مدد کی توقع تھی۔ اس نے بڑی جرأت سے کام لیتے ہُوئے نیز و مدد پہنچانے کی کوشش کی۔ راستے میں ایک جگہ مجاہدین سے جھڑپ بھی ہوئی لیکن وہ نیز و پہنچا اور وہاں سے محصُور افراد کو نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے بعد فرٹیگ نے بھاری تعداد میں فوج اکٹھا کی اور ۱۴ دسمبر کو سات بٹالینوں کے علاوہ ۱۳۵۰ ریکروٹ، ۱۴۰۰ فوجیوں اور ۱۸ توپوں کے ہمراہ کارانیشچی پہنچا، جہاں اس نے امامؒ کو محاصرہ اٹھا لینے پر مجبور کر دیا۔ اب گورکو ۱۶ دسمبر کو زیریانی کی مدد کے لیے پہنچا اور اگلے دن مہینے بھر کی بھُوک کے ستائے ہوئے یہ فوجی شورا پہنچے۔ مجاہدین نے ان پر پیچھے سے حملہ کر دیا تھا اور وہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر بھاگ سکے تھے۔ امامؒ واپس اودیریا چلے گئے، مقامی اجتماعات منتشر کر دیے گئے اور ۲۲ دسمبر کو گورکو اور فرٹیگ اپنے اپنے ہیڈ کوارٹرز کی جانب روانہ ہو گئے۔ ۱۸۴۳ء میں کرسمس کے موقع پر جنگ وقتی طور پر بند ضرور ہوگئی تھی لیکن روسیوں کو اب بھی مزید خطرے کا سامنا تھا۔ ۲۷ اگست سے اب تک ان کے ۹۲ افسر اور ۲۵۲۸ سپاہی، ۱۲ قلعے ہاتھ سے نکل چکے تھے اور ۲۷ توپوں کا نقصان ہو چکا تھا۔

آخوردی ماہوماؒ کی شہادت:

امامؒ کو اس سال کافی کامیابیاں نصیب ہوئیں لیکن انھیں ایک بھاری صدمہ بھی اٹھانا

پڑا۔آخوردی ماہوماؒ جو چیچنیا صغیر کے نائب ہونے کے علاوہ امامؒ کے قریب ترین ساتھیوں میں سے تھے، شاتل کے محاصرے کے تیسرے دن شہید ہو گئے۔مریدین نے شاتل کا محاصرہ اٹھا لیا اور آخوردی ماہوماؒ کی نعش کو واپس لے جا کر دفن کر دیا۔آخوردی ماہوماؒ امام کے بڑے مخلص ساتھی تھے اور شروع سے آخر تک ان کے ساتھ رہے تھے۔

نکولائی کا خط:

شہنشاہ نکولائی اپنے جرنیلوں کی پے در پے ناکامیوں اور جاں نثاروں کی قربانیوں کے رائیگاں جانے پر بہت مغموم تھا۔اس نے جنرل نیڈرات کے نام ۱۸۴۳ء کے آخر میں جو خط لکھا تھا اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اسے اس صورتحال پر گہرا رنج تھا۔لیکن پیٹرز برگ کے محلوں میں رہتے ہوئے وہ اپنے جرنیلوں کی مشکلات اور مصائب کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔اس نے جنرل نیدرات کو حکم دیا کہ پہاڑوں میں پہنچ کر شامل کے طوفانی دستوں کو منتشر کر دو، اس کے قلعوں کو تباہ کر دو اور اس کی تمام تر فوجی قوت اور اثر ورسوخ کو ملیا میٹ کر دو جہاں کہیں مناسب سمجھو، نئے قلعوں کی تعمیر کرو اور اس کے لیے تمام ممکن اقدامات کرو۔ان مقاصد کی تکمیل کے لیے اس نے قفقاز کی فوج کو نئے سرے سے منظّم کرنے کا حکم دیا۔ساتھ ہی ۲۶ بٹالینیں جس میں انجینئرز کی بٹالین بھی شامل تھی، کاسک فوج کی ۴ رجمنٹیں اور ۴۰ توپوں کے علاوہ ۲۲ ہزار آزمودہ کار سپاہی بھی بطور کمک روانہ کر دیے۔

اس نے لکھا تھا:

”جہاں تک جنگی منصوبہ بندی کا تعلّق ہے، میرا وزیر جنگ تمھیں مکمل ہدایات دے دے گا۔ان ہدایات کا مقصد تمھیں ناروا بندشوں میں جکڑنا نہیں بلکہ ان سے تمھیں صورت حال کے بارے میں میرے خیالات کا پتہ چل سکے گا اور ساتھ ہی ان فوجوں کے بارے میں بھی معلومات مل سکیں گی جنھیں میں اس مہم کے لیے تمھارے سپرد کر رہا ہوں۔یہ کام تمھارا ہے کہ تم چاہے ان خیالات سے پوری طرح متفق ہو یا ان میں سے صرف چند سے اتفاق رائے کرو۔لیکن تمھیں اس

بات کا دھیان رکھنا ہوگا کہ میں اتنی بڑی فوج اور اتنے ذرائع کو تمھارے سُپرد کرنے کے بعد اسی تناسب سے بہتر نتائج کی توقع رکھتا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمام مُہمات میں اپنے پیش نظر مقاصد ہی کی تکمیل کو اپنا مدّعا سمجھنا چاہیے۔ ادھر اُدھر کے مسائل میں اُلجھنا سُودمند نہ ہوگا یہ فوجیں اور یہ تمام کمک دسمبر ۱۸۴۴ء کے بعد قفقاز سے بہرصورت واپس آجانی چاہئیں۔"

اس نے جنرل نیدرات کو سیاسی امُور کی طرف متوجہ ہونے کے لیے بھی کہا اور امامؒ کے ساتھیوں میں پھُوٹ ڈلوانے کی کوشش کی طرف توجہ دلائی۔ اس نے کہا کہ امامؒ کے حامیوں کو روپیہ دے کر توڑنے کی کوشش کی جائے۔ خاص طور پر امامؒ کے اُستاد اور سسر جمال الدین، اخوشا اور سوذاخر کے قاضیوں اور تلیتی کے کبیت ماہومؒا کو ہر قیمت پر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی جائے۔ امامؒ کے قریبی ساتھیوں میں پھوٹ ڈال کر متذبذب قبائل کو اپنے ساتھ ملا لیا جائے۔ جہاں تک رہنماؤں سے معاملہ طے کرنے کا تعلق تھا، ڈولگوروکوف کو اس کا ذمہ دار بنا دیا گیا۔ کوہستانیوں کے بارے میں شہنشاہ کا یہ خیال تھا کہ وہ اتنی بڑی تعداد میں افواج کو دیکھ کر اطاعت قبول کر لینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ افواج کی کثرت اور ان کے رُعب داب کے علاوہ شہنشاہ نے یہ اعلان بھی جاری کیا کہ مقامی افراد کے مذہب، جائیداد اور رسوم و رواج سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا اور یہ کہ مہم کا مقصد صرف امام شاملؒ اور اس کے ساتھیوں کی سرکوبی ہے۔

برصغیر میں سرحد میں مردان کے قریب امبیلا ❶ (۱۸۶۳ء) کی جنگ کے موقع پر بھی اسی قسم کی صُورت حال پیش آئی تھی جب کہ مجاہدین کے مرکز ستھانہ اور ملکا کو تباہ کرنے کے لیے انگریزوں نے بونیر کے قبائل کو اسی طرح کے خطُوط لکھے تھے کہ ان کا مقصد صرف مجاہدین کے مرکز کو تباہ کرنا ہے اور یہ کہ قبائل سے کسی قسم کا تعرّض کا ارادہ نہیں۔

❶ یہ وسط ایشیا اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی متحدہ قوت اور انگریزوں کی نہایت خوں آشام جنگ تھی اور اس میں دس ہزار انگریز سپاہ تباہ ہوئی۔ اگرچہ وہ جنگ جیت نہ پائے لیکن انھوں نے قبائل کے ساتھ ساز باز اور مقامی خوانین سے جوڑ توڑ کے ذریعے مجاہدین کو کافی نقصان پہنچایا۔ سوات کی ریاست بھی اسی جنگ کے بعد تشکیل کی گئی۔

امامؒ کی کامیابیوں کا دائرہ صرف انھی جگہوں تک محدود نہیں تھا جہاں انھوں نے فوجی مہمات میں حصہ لیا تھا بلکہ کیسپین کے کنارے کتیا گو اور تباسران کے اضلاع میں بھی بغاوتیں شروع ہو گئی تھیں۔ جنوب میں قاضی قوموخ کے علاقوں میں رُوس کے خلاف تحریک شروع ہو چکی تھی اور اس کا سلسلہ جارد کے قبیلوں تک پھیل چکا تھا۔ شمال میں قوموخ کے امن پسند قبائل تک مشتعل ہو چکے تھے اور قفقاز کے مغرب میں کبارڈا کے جنگو قبائل نے بھی رُوسی استبداد کا جوا اپنی گردنوں سے اُتار پھینکنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ امامؒ کے اثرات کہاں کہاں تک پھیل چُکے تھے، اس کا اندازہ ان دُور دراز علاقوں میں پیش آنے والے واقعات سے اچھی طرح ہو سکتا تھا۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ امامؒ عام معنوں میں ایک فوجی لیڈر ہی نہ تھے، وہ رُوس کے خلاف تمام قوتوں کے لیے ایک مرکز کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔

امامؒ کے بڑھتے ہوئے اثر ورسُوخ کو روکنے کے لیے شہنشاہ نے بڑی تعداد میں فوجیں اور دُوسرے وسائل جنرل نیدرات کے سُپرد کر دیے تھے۔ جنرل نیدرات کے پاس آزمودہ کار جرنیلوں کی ایک ٹیم موجود تھی۔ فریٹگ، آرگوٹینگی، ڈولگوروکوف، کلنگو، پاسک، وڈکیموف اور کئی دوسرے تجربہ کار افسر اس کی معاونت کر رہے تھے۔ لیکن خود کمانڈر انچیف اس عظیم کام کے سرانجام دینے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا اور دوسری طرف اوپر سے دیے گئے احکامات اسے پابند کیے ہوئے تھے۔

نکولائی آمرانہ مزاج رکھنے والا شہنشاہ تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی شخص کو اس کے حکم سے سرتابی کی مجال ہو۔ پھر اسے اپنے علم اور عقل کے بارے میں بھی کچھ زیادہ ہی خوش فہمیاں تھیں، نتیجہ صاف ظاہر تھا۔ جس کام کی تکمیل کے لیے اس نے صرف بارہ مہینے کی مہلت دی تھی، اسے بارہ سے زیادہ سال لگ گئے۔ علاوہ ازیں اس نے ان مہمات کو انجام دینے کی جو ہدایات دیں وہ ان حالات میں قطعی طور پر ناممکن تھیں۔ وادی آندی کو بہار ۱۸۴۴ء تک فتح کیا جانا تھا لیکن اس کام کو ۱۵ سال سے زیادہ عرصہ لگ گیا اور یہ اُس وقت انجام پایا جب کہ لڑائی بالکل ختم ہو چکی تھی۔

عوام کو غیر جانب دار بنانے کا منصوبہ بھی بُری طرح ناکام رہا۔ امامؒ نے ان تمام لوگوں کو جو ان کی تحریک کے علاوہ کسی بھی اور اجتماع میں شریک ہوں، سزائے موت دینے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے بعد رُوسیوں کی طرف سے کسی قسم کے اعلانات کی اشاعت ممکن نہ تھی۔

۱۸۴۴ء میں شہنشاہ کو توقع تھی کہ سال کے پہلے حصے میں فتوحات کے بعد آخری چھ ماہ ان فتُوحات کے استحکام اور قلعہ بندیوں میں گزریں گے۔ لیکن زار کی فوجوں کو اس سارے سال میں کوئی بھی نمایاں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ امامؒ کی پوزیشن پہلے کی طرح مستحکم تھی۔ بلکہ اس سال ایک اہم واقعہ یہ پیش آیا کہ ایلسو کا سلطان دانیال، جو روسیوں کا مُعتمد علیہ باجگزار اور رُوسی فوج میں میجر جنرل کے عہدے پر فائز تھا، امامؒ کے ساتھ آملا۔ اس کی وجہ سے جنوبی داغستان کے کئی علاقے امامؒ کے زیرنگیں آگئے۔

باب ہفتم:
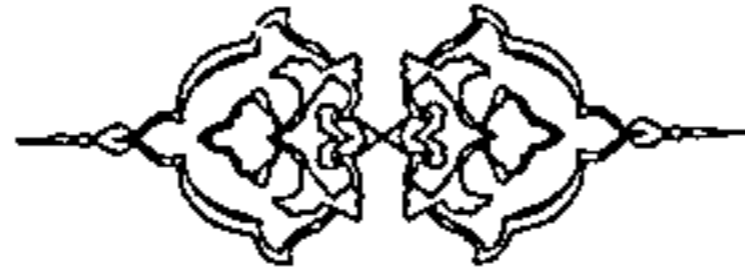
# دارگو کی ناکام مہم

شہنشاہ نکولائی کی تمام تر توقعات خیالِ خام ثابت ہوئی تھیں۔ ۱۸۴۴ء کی مہم ناکام ہو چکی تھی۔ لیکن پھر بھی اسے اپنی فوجوں کی تعداد اور ساز و سامان کی کثرت پر ناز تھا۔ وہ وسائل کی اہمیت خوب سمجھتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی افواج کو ہر قسم کے ساز و سامان سے لیس کیا اور امام شاملؒ کے دستوں کو منتشر کرنے کی ہدایات دینے کے ساتھ ساتھ ایک بار پھر یہ کہا کہ پانچویں کور کو سال کے ختم ہونے تک قفقاز سے واپس آنا ہوگا۔

**ورونٹسوف کا تقرّر:**

جنرل نیدرات کی جگہ، نپولین کے خلاف جنگوں میں کار ہائے نمایاں انجام دینے والے، کاؤنٹ ورونٹسوف کو ان مُہمات کا کمانڈر مُقرر کیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ اسے وائسرائے کا عُہدہ بھی دیا گیا۔ ورونٹسوف کو قفقاز میں آ کر پتہ چلا کہ شہنشاہ نے اسے جن مُہمات کو سال بھر میں مکمل کرنے کے لیے کہا تھا، ان کے بارے میں مقامی کمانڈروں کی رائے زیادہ حوصلہ افزا نہ تھی۔ مقامی کمانڈر جن میں فرٹیگ، ڈولگوروکوف اور ارگوٹنکی شامل تھے، ان تجاویز پر اعتراضات کر رہے تھے لیکن کاؤنٹ سینٹ پیٹرز برگ کی جنگی کونسل سے حال ہی میں آیا تھا اور شہنشاہ کی امیدوں اور توقعات کو پورا کرنے کا جذبہ رکھتا تھا۔ وہ بھی اپنے پیش رو کی طرح ان تمام اعتراضات کو چنداں اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے ان مہمات کے لیے فوج کے جمع ہونے تک اپنے ذاتی تجربات اور مقامی حالات کو مدّنظر رکھتے ہوئے سوچ بچار شروع کر دی تھی۔ ۲۵ مئی ۱۸۴۵ء کو اس نے وزیر جنگ کے نام ایک مراسلے میں لکھا:

''ہم اپنی پوری کوشش کریں گے کہ اس مُہم کے دوران شاملؒ کو زک پہنچانے کی کوشش کریں۔ اگر ہم خدانخواستہ اس مہم میں ناکام بھی ہو گئے تو مطمئن ہوں گے

کہ کم از کم ہم نے شہنشاہ کے احکامات بجالانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ آئندہ سال ہم شامل کے خلاف باقاعدہ کارروائیاں کریں گے، البتہ اس بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ہم اس کو مکمل طور پر زیر کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

جب مہم کا رہنما ہی شک وشبہ کا اظہار شروع کر دے تو اس مہم کی کامیابی کے بارے میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سینٹ پیٹرز برگ کے حکمرانوں کو امامؒ کی صحیح طاقت اور ان کے مریدوں کے جذبہ جہاد کے بارے میں صحیح اطلاعات نہیں تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ زیادہ فوج اور زیادہ وسائل کی مدد سے امامؒ کو زیر کیا جا سکتا ہے۔ یوں بھی تاریخ میں اس کی مثال موجود نہیں تھی۔ پھر زار کو اپنے جرنیلوں، فوجی طاقت اور مُلک کے وسائل پر اتنا ناز تھا کہ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ ان سب کی موجودگی میں شکست ہو سکتی ہے۔ یہ حکمران پیٹرز برگ کے محلوں میں بیٹھے ہوئے جنگی کونسل میں نقشوں کی مدد سے داغستان اور چیچنیا کے پہاڑوں اور جنگلوں میں پیش آمدہ مشکلات کا قطعی کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔ اکثر یہ ہوتا کہ مقامی حالات کو جانے بغیر وہ اپنے کمانڈروں کو ایسے مشن سُپرد کر دیتے جو ان حالات میں خودکُشی کے مترادف ہوتے۔ کمانڈر زار سے وفاداری کا اظہار کرنے پر مجبور تھے اور حکم حاکم مرگِ مفاجات کے مصداق ان احکامات سے سرتابی کی مجال نہیں رکھتے تھے۔ کاؤنٹ ورونٹسوف پیش آنے والی مشکلات کا اندازہ رکھتے ہوئے بھی وزیر جنگ کو صرف یہ لکھ سکا کہ:

"مجھے اس مہم میں زیادہ کامیابی کی توقع نہیں لیکن میں شہنشاہ کی توقعات پر پُورا اترنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

اگلے ہی روز کاؤنٹ ونزپایا سے اس مہم کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کے ہمراہ چیچنیا کا کالم تھا جس میں ۱۲ پیادہ بٹالینیں، انجینئرز کی دو کمپنیاں، ۱۳ کاسک سوار دستے، ۱۰۰۰ مقامی ملیشیا اور ۲۸ توپیں تھیں۔ ۳ جون کو غرتم کے مقام پر داغستان کا کالم بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا جس میں ۹ بٹالینیں، انجینئرز کی دو کمپنیاں، دو نشانہ بازوں کی کمپنیاں، ۳ رسالہ کے دستے اور ۱۸ توپیں

تھیں۔کل تعداد ۱۸۰۰۰ کے لگ بھگ تھی۔حقیقت یہ ہے کہ اب تک اتنی بڑی تعداد میں اور اتنے سازوسامان سے لیس فوج داغستان اور چیچنیا کے علاقے پر حملہ آور نہیں ہوئی تھی۔

امامؒ کی جنگی بصیرت:

امامؒ کی جنگی بصیرت کی داد دینی چاہیے۔انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ان حالات میں کہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی اور اس کے پاس خاصی تعداد میں اسلحہ بھی تھا۔اس پر حملہ خودکشی کے مترادف ہوگا۔ایک اچھا کمانڈر صورتحال کا اندازہ لگا کر اپنی فوجوں کو آگے بڑھاتا ہے۔امامؒ کو پتہ تھا کہ یہ لمبی چوڑی فوج پہاڑوں میں بآسانی دُور تک پہنچ تو سکتی ہے لیکن اس کے لیے وہاں زیادہ عرصہ قیام یا جنگ ممکن نہیں ہوگی۔انھیں معلوم تھا کہ دشمن کو کھلے میدان میں شکست دینا تو درکنار، مارچ کے دوران بھی اس پر حملے ان حالات میں زیادہ سودمند نہ ہوں گے۔انھوں نے بجا طور پر اندازہ لگایا تھا کہ اصل وقت تب آئے گا۔جب یہ کالم جنگوں میں خوار ہو کر واپس ہو رہا ہوگا، سپاہی لمبے سفر کی وجہ سے تھک ہار چکے ہوں گے اور اسلحہ اور رسد کی وجہ سے ان کے حوصلے پست ہو چکے ہوں گے۔اس وقت امامؒ اپنے مریدوں سمیت ان پر ٹوٹ پڑیں گے اور انھیں تہس نہس کر دیں گے۔

امامؒ نے اعلیٰ درجے کی جنگی مہارت کا ثبوت دیا تھا۔ان کا خیال تھا کہ اگر رُوسی کسی طرح بچ بچا کر سولک یا سونجہ پہنچ بھی جائیں تو شکست کی وجہ سے ان کی حالت اس درجہ ابتر ہو چکی ہو گی کہ وہ نہ صرف اپنی نگاہوں میں بلکہ کیسپین سے لے کر بحیرۂ اسود اور ترکی سے لے کر ایران کی سرحدوں تک ہر شخص کی نظروں میں رُسوا ہو چکے ہوں گے۔اس اثناء میں امامؒ کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ کچھ فوج رُوسیوں کو بہکانے کے لیے استعمال کریں گے تا کہ وہ انھیں دارگو کے مضبوط قلعے تک لانے میں کامیاب ہو جائے۔پھر امامؒ ورنٹسوف کا بھی ویسا ہی حشر کرنے میں کامیاب ہوسکیں گے جیسا کہ انھوں نے ۱۸۴۲ء میں گریب کا کیا تھا۔

رُوسیوں کی پیش قدمی:

تمام رُوسی کالم ۳ جون ۱۸۴۵ء کو اکٹھے ہو کر چل پڑے۔انھیں پچھلے سال ترنگول گلی میں

امامؒ کے مریدوں کے خلاف خاصا نقصان اُٹھانا پڑا تھا اور خیال یہ تھا کہ اس مقام پر امامؒ کے دستوں سے مقابلہ ضرور پیش آئے گا۔ اس مقابلے میں فتح رُوسیوں کے لیے ایک اچھا شگون ثابت ہوسکتی تھی لیکن ان کو خاصی مایوسی ہوئی کیونکہ انھیں یہاں کسی قسم کی مزاحمت پیش نہیں آئی۔ آگے چل کر انجیمیر کے مقام پر مریدین کے ساتھ مقابلہ ضرور پیش آیا لیکن معمولی سی جنگ کے بعد مریدین پسپا ہو گئے۔

ورونٹسوف نے اس مقابلے کا حال اپنی رپورٹ میں تحریر کرتے ہوئے لکھا کہ:

''میں نے اگر اتنی مضبوط پوزیشن پر اتنی بہادری سے حملہ آج تک نہیں دیکھا۔''

اس مبالغہ آمیز رپورٹ سے قطع نظر اگر یہ دیکھا جائے کہ اس مقابلے میں صرف ۱۷ رُوسی زخمی ہوئے تو معلوم ہو جائے گا کہ مریدین کا ارادہ یہاں مقابلے کا تھا ہی نہیں۔ اس مہم میں سب سے پہلی غلطی ۶ جون کی صبح کو کی گئی جب پاسک انتظار کیے بغیر خاصا آگے بڑھ گیا۔ تقریباً ۱۰ میل دُور ذنومیر کے مقام پر وہ باقی ماندہ فوج سے کٹ گیا اور یہاں گرمی کی حدّت کے باوجود موسم یکایک بدل گیا۔ سخت قسم کی برفانی ہوائیں چلنے لگیں اور برف پڑنا شروع ہوگئی، نتیجہ ظاہر تھا۔ پانچ دن تک یہ رُوسی سپاہی برف، کُہر اور ہوا کے طوفان کے باعث باقی فوج سے کٹے رہے۔ ان کے پاس سامانِ رسد بھی نہ تھا۔ بہت سے سپاہی کُہر کی وجہ سے زخمی ہو گئے اور ۵۰۰ گھوڑے مر گئے۔

### امامؒ کی جنگی چال:

ورونٹسوف پاسک کے ساتھ ۱۱ جون کو آملا اور ۱۲ جون کو تلیتی کے قریب ایک کُھلے میدان میں امام شاملؒ کی افواج سے مقابلے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ اسے جاسُوسوں نے یہ اطلاع پہنچائی تھی کہ امامؒ اس جگہ کا دفاع آخر دم تک کریں گے۔ اگلے روز حملہ کیا گیا لیکن ایک بار پھر رُوسیوں کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ آندی کے دروازے پر کسی قسم کا مقابلہ پیش نہیں آیا حالانکہ مُقابلے کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ امامؒ کا ارادہ تھا کہ فوج کو دیکھ کر آخری فیصلہ کیا جائے۔ جب انھوں نے کثیر تعداد میں فوج اور توپ خانہ دیکھا تو ناکامی اٹھانے کی بجائے وقتی طور پر پسپائی

اختیار کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ انھوں نے آندی کو آگ لگا دی اور قریبی علاقے کے تمام افراد کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ امامؒ نے اب اول پہاڑ کی بلندیوں پر چھ ہزار افواج اور تین توپوں کے ساتھ پوزیشن لے لی تاکہ جب روسی فوجیں نیچے پہنچیں تو انھیں زک پہنچائی جائے۔ یہاں بھی پہاڑ خالی کروالیا گیا اور امام شاملؒ اپنی توپوں سمیت واپس ہو گئے۔ اس واقعہ پر شہنشاہ نے لکھا۔ خُدا کا شکر ہے کہ اس نے روس کے بہادر سپاہیوں کو یہ فتح دی۔ مجھے یقین ہے کہ تم شامل کے اثر ورسوخ کو ملیا میٹ کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔

اب تک روسی افواج کی پیش قدمی بڑی کامیابی سے جاری تھی۔ انھوں نے آندی پر قبضہ کرلیا تھا اور پہاڑوں میں دُور تک جا گھسے تھے لیکن امامؒ کو نقصان نہیں پہنچایا جا سکا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ امامؒ نے دشمن کو اس بات کا موقع تک نہیں دیا تھا کہ وہ انھیں کسی قسم کا نقصان پہنچا سکے۔ پہاڑوں میں اتنی دور تک روسی اقتدار کا قیام ناممکن سی بات تھی۔ آندی میں قیام تقریباً ناممکن تھا کیونکہ موسم گرما میں بھی وہاں تک سامان رسد پہنچانا انتہائی دشوار تھا۔ سال کے باقی حصے میں تو یہ کام بالکل ناممکن تھا۔

فرنگ کا یہ خیال درست تھا کہ اس پیش قدمی کا زیادہ سے زیادہ فائدہ یہ تھا کہ پہاڑوں میں دُور تک پہنچ کر بغیر کسی نقصان کے واپس آ جایا جائے۔ یہاں کسی قسم کی کامیابی کی توقع ہی بے سُود تھی۔ اتنی بڑی فوج کے لیے سامانِ رسد کی فراہمی کا مسئلہ پہلے ہی روز بروز مشکل نظر آ رہا تھا۔ آندی میں صورت حال یہ تھی کہ فوج کے تہائی سے زیادہ حصے کو راستے کی حفاظت کے لیے متعین کیا گیا تھا اور داغستان کے کالم کمانڈر پرنس بیبوٹوف کو رسد کی فراہمی کے لیے خاص ہدایات دی گئی تھیں۔ اس کے باوجود سپاہیوں کو چار دن تک مقدار سے کم راشن دیا جاتا رہا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ اب بھی صورت حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے واپسی اختیار کی جاتی لیکن وار گو صرف دس میل دُور تھا اور شاید اسی وجہ سے ورونٹسوف نے سوچا کہ ۱۰ ہزار کی شاندار فوج کے باوجود اگر شاملؒ کے اس مضبوط قلعے پر حملہ نہ کیا گیا تو مہم کا تمام مقصد فوت ہو جائے گا۔ اس نے امامؒ کے قلعے پر حملے کا فیصلہ کرلیا۔ ''شاندار'' کا لفظ صحیح طور پر استعمال کیا گیا ہے

کیونکہ شان وشکوہ کے اعتبار سے شاید ہی اس سے بہتر کسی فوج کو تصور کیا جا سکے۔

## رُوسی فوج کی شان وشکوہ:

کاؤنٹ ورونٹسوف کی شہرت بحیثیت کمانڈر مسلمہ تھی اور یہی وجہ تھی کہ ماسکو اور سینٹ پیٹرز برگ کے اہم خاندانوں کے افراد شاملؒ کو شکست دینے والی اس مہم میں ورونٹسوف کے ہمراہ تھے۔ قفقاز کی مکمل فتح کا سہرا اپنے سر بندھوانے کی غرض سے خاصے اہم لوگ اس مہم میں شریک تھے۔ ورونٹسوف کے سٹاف افسروں میں پرنس ایلیگزینڈر، پرنس وٹگنسٹین، پرنس اوف وارس اور روس کے بڑے بڑے خانوادوں کے فرزندانِ گرامی قدر اپنے پرشکوہ لباس سمیت شامل تھے۔ پھر کرُدوں کا بینڈ بھی ساتھ آیا ہوا تھا۔ جنرل لوڈر جو کہ پانچویں کور کا کمانڈر تھا، کلنگو پاسک اور دوسرے جنرلوں کے اپنے اپنے سٹاف افسروں کی تعداد خاصی تھی۔ ان تمام افسروں کے اپنے اپنے علم تھے اور نیزوں سے باندھی ہوئی لال نیلی پٹیاں اس نمائش کی رنگینی میں اضافہ کر رہی تھیں۔

کمانڈر انچیف کا نشان سُرخ اور سفید، جنرل لوڈر کا نشان سُرخ اور سیاہ اور چیف آف سٹاف گورکو کا نشان سُرخ تھا۔ پاسک کا نشان سفید تھا اور اس پر چاندی کی صلیب بنی ہوئی تھی۔ اسی طرح دوسرے نشانات اور علم تھے۔ الغرض تمام فوج کی شان وشکوہ کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ قفقاز میں لڑنے کی بجائے زار کے جشنِ تاجپوشی میں تشریف لائے ہوئے ہوں۔ بڑے بڑے نوابوں اور رئیسوں کے فرزندوں کے ہمراہ ان کے ذاتی نوکروں، خانساموں اور بیروں کا لشکر الگ تھا۔ کیمپ کے لیے فرنیچر، افسروں کے سٹور اور خیمے اتنے زیادہ تھے کہ کسی بھی لڑائی میں اس سامان کو ساتھ لے کر چلنا خاصا مشکل کام ہوتا کجا یہ کہ قفقاز کے پہاڑوں اور جنگلوں میں لڑنے والی فوج یہ سامان لے کر چلے۔ جہاں ایک طرف بگڑے ہوئے نوکروں کی فوج مقامی سپاہیوں کے لیے مشکلات پیدا کر رہی تھی وہاں دوسری طرف سٹاف افسروں کی فوج ظفر موج کو بھی قفقاز میں لڑنے والے افسر کچھ زیادہ عزت واحترام کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور نہ یہ سٹاف افسر قفقاز کے افسروں کا اکھڑ پن پسند کرتے تھے۔ انھیں اس بات کا ضرور

اعتراف تھا کہ ان لوگوں نے قفقاز میں ان کے دشمنوں کے خلاف جنگیں لڑیں اور دادِ شجاعت دی لیکن پھر بھی وہ احساسِ رفاقت جو موجود ہونا چاہیے تھا، یہاں نہیں تھا۔

اس صورتِ حال میں اچھے نتائج کی توقع کرنا بے سُود تھا۔ یہ سٹاف افسر میٹھی زبان ضرور بول سکتے تھے اور شاید کاغذی جنگ میں بھی خاصی مہارت رکھتے ہوں لیکن قفقاز کے پُر خطر جنگلوں میں امامؒ کے طوفانی دستوں کا مقابلہ ان کے بس کی بات نہ تھی۔ لڑائی کے میدان میں مقامی بٹالینوں اور مقامی افسروں ہی کو سب سے زیادہ مقابلے اور نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔

سامان رسد خاصی دیر کے بعد اور جب آیا بھی تو یہ بمشکل چند روز کے لیے کافی تھا۔ ورونٹسوف آندی میں تین ہفتے تک صرف سامان رسد ہی کے انتظار میں رُکا رہا جہاں تک مقامی اعتبار سے رسد کی فراہمی کا تعلُق ہے، یوں لگتا تھا کہ فوج کسی لق ودق صحرا میں پڑی ہوئی ہے۔ امام شاملؒ نے میلوں تک کوئی بھی ایسی چیز نہیں رہنے دی تھی جو کسی طرح اس کے کام آ سکتی مقامی افراد لالچ میں آ کر شاید ان افواج کی مدد کرتے لیکن امامؒ نے اس کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ ایک رُوسی افسر کو گشت کے دوران دو کٹے ہوئے سر نظر آئے جن پر تاتاری زبان میں یہ عبارت لکھی ہُوئی تھی:

"روسی حکومت کی مدد کرنے والوں کا انجام دیکھ لو۔"

شدید گرمی کے باعث گھاس دُور دُور تک جل چکی تھی اور گھوڑوں کا حال انسانوں سے بھی کہیں بدتر تھا۔ ۱۸ تاریخ کو خاصی تعداد میں فوج یونخ کی طرف بھیجی گئی تا کہ وہ سامان رسد مہیا کر سکے لیکن اردجام کی جھیل میں چند درجن ٹراوٹ مچھلیاں شکار کر کے وہ خالی ہاتھ واپس لوٹی چنانچہ اس مہم کا نام ہی "ٹراوٹ مہم" پڑ گیا۔

**دارگو پر چڑھائی کا فیصلہ:**

۴ جولائی کو جب ورونٹسوف کو یہ علم ہوا کہ صرف چند دن کا راستہ باقی رہ گیا ہے اور رسد کا قافلہ ۱۰ جولائی سے پہلے نہیں پہنچ سکے گا تو اس نے ۶ جولائی کی صبح کو دارگو پر چڑھائی اور فوج کے کچھ حصے کو رسد لانے کے لیے واپس بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ ۶ جولائی کی صبح ۳ بجے کاؤنٹ

ورونٹسوف کا داغستانی نوکر جو درحقیقت امامؒ کے شعبہ سُراغ رسانی سے تعلق رکھتا تھا، امامؒ کو حملے کی اطلاع دینے کے لیے کاؤنٹ کا گھوڑا اُڑا کر چل پڑا۔ ایک گھنٹے کے بعد فوج روانہ ہُوئی اور ۹ بجے تک تمام فوج جنگل کے کنارے تک پہنچ چکی تھی۔ یہاں فوج نے حملے سے پہلے کچھ گھنٹے آرام کیا اور کھانا کھایا۔ شمال کی طرف ایک خوب صورت منظر سامنے تھا۔ نیچے دور تک گھنے جنگلوں میں سے دریائے تریک ایک نقرئی دھار کی طرح بہتا نظر آ رہا تھا۔ اس حسین منظر کے اُس پار روس کی سرحدیں نظر آ رہی تھیں اور نہ جانے کتنے ہی سپاہیوں کو روس کی جانب آخری بار دیکھنا نصیب ہو رہا تھا۔

دارگو جانے والے راستے کی کل لمبائی چار یا پانچ میل سے زائد نہ تھی لیکن یہ راستہ ایک گھنے جنگل کے بیچ میں سے ہو کر گزرتا تھا، جہاں کئی جگہ گہری اُترائی اور کئی جگہ سخت چڑھائی تھی۔ اس کے علاوہ یہ رستہ کسی مقام پر اس قدر تنگ ہو جاتا تھا کہ بمشکل دو افراد ساتھ ساتھ چل سکتے تھے۔ پھر ہر چار سو یا پانچ سو گز پر بڑے بڑے درختوں کی رکاوٹیں موجود تھیں۔ ان درختوں کی شاخیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔ مزید یہ کہ راستے کے دائیں بائیں ہر طرف مریدین چُھپے ہوئے گوریلا کارروائیوں کے لیے تیار تھے۔

رُوسیوں کی پیش قدمی:

جنرل لوڈر نے ایک بجے دوپہر کے قریب پیش قدمی کرنے والی رجمنٹ سے خطاب کیا اور سپاہیوں نے بندوقیں سر پر اٹھا کر اس معرکے کو سر کرنے کی قسم کھائی۔ پیش قدمی شروع ہو گئی۔ ابتدا میں چھ سات رکاوٹیں بڑی آسانی سے عبور کر لی گئیں اور کچھ زیادہ نقصان بھی نہیں ہُوا۔ ان کے پیچھے پیچھے انجینئرز کی کمپنیاں باقی کالم کے لیے راستہ صاف کر رہی تھیں۔ پیش قدمی کا انداز مریدین کے گوریلا دستوں کے لیے خاصا موافق تھا۔ وہ کوشش کرتے کہ اس کالم کی مختلف ٹکڑیوں کو نشانہ بنائیں اور پُورے کالم کو ایک ایک کر کے ٹھکانے لگا دیں۔ کمانڈر انچیف، جنرل لوڈر، اس کے سٹاف افسر اور پرنس ایلیگزنڈر خاموشی سے گزر رہے تھے کہ یکا یک ایک جانب سے گولیوں کی بوچھاڑ آنا شروع ہو گئی۔ یہ سب افراد شدید خطرے میں

گھر چکے تھے۔ یہاں ۴۰ رُوسی افسر تھے اور دُوسری طرف سے مریدین کا فائر لمحہ بہ لمحہ تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ ایک پہاڑی توپ منگوائی گئی اور اس نے ایک گولہ اُس طرف پھینکا جہاں سے فائر زیادہ آ رہا تھا۔ لیکن ابھی دوسرا ہی گولہ چلا تھا کہ توپ چلانے والے سب توپچی یا تو مارے گئے یا شدید زخمی ہو گئے۔ توپ چلانے کے لیے دوبارہ کمک منگوائی گئی تب بھی ایسا ہی ہُوا۔ تھوڑی ہی دیر میں توپ کے گرد و پیش لاشوں اور زخمیوں کا انبار لگ گیا۔ پھر ایک توپچی توپ کی طرف بڑھا اور ایک افسر بھی لپکا لیکن توپ نہ چل سکی۔ اس موقع پر جنرل فوک خود آگے بڑھا اور توپ میں گولہ بھرا لیکن اس سے پیشتر کہ وہ توپ چلاتا وہ بھی ڈھیر ہو گیا۔

اب ورونٹسوف نے ملیشیا کے کچھ جوان اور کاسک سپاہی جنگل میں بھیجے۔ کچھ دیر میں راستہ دوبارہ صاف ہو گیا۔ ورونٹسوف نے پیش قدمی کرنے والے دستوں کو دارگو پر قبضہ کرنے کا حکم دے دیا۔ لیکن اس وقت دارگو جل رہا تھا۔ امامؒ نے یہاں آگ لگانے کے احکامات جاری کر دیے تھے۔ رات گئے کمانڈر انچیف خود دارگو پہنچا اور قریبی میدان میں خیمے لگا دیے گئے۔ ۷ جولائی کی صبح تک باقی کالم پہنچتے رہے۔ اس سفر میں نقصان زیادہ نہیں ہوا لیکن پھر بھی توقعات سے کہیں بڑھ کر تھا۔ اب تک ایک جنرل اور تین دُوسرے افسر اور ۳۲ سپاہی ہلاک، ۱۹ افسر اور ۱۶۰ سپاہی زخمی ہو چکے تھے۔

امامؒ کے دارالخلافہ پر قبضہ ہو چکا تھا۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ امامؒ اپنی تمام جمعیت کو صاف بچا کر لے گئے تھے اور ان کا بہت معمولی نقصان ہوا تھا۔ دارگو میں رہنا دشوار تھا اور ابھی ۲۷ میل لمبے جنگل کو عبور کرنا باقی تھا۔ اس طویل راستے کا ایک ایک گز انتہائی پُر خطر تھا۔ ۱۸۴۲ء میں گریب کو اس سے نصف فاصلہ طے کرتے ہوئے بھاری نقصان اٹھا کر شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا جب کہ اس کی افواج کی تعداد اتنی ہی تھی۔ لیکن امامؒ کے لشکر کی تعداد صرف ۲ ہزار تھی۔ امامؒ کے طوفانی دستے اسی موقع کی تلاش میں اس کے منتظر تھے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے قفقاز کے جنگی ماہرین کا یہی خیال تھا کہ خطرات بہت زیادہ ہیں لیکن بعد میں کی گئی غلطیوں نے روسیوں کی حالت کو اور بھی زیادہ سنگین بنا دیا۔ ابھی پانچ دن کا راشن باقی تھا۔ عقلمندی کا تقاضا

یہی تھا کہ غرزل کی جانب جلد از جلد پیش قدمی کی جائے اور داغستان کے کمانڈر کو سولک پہنچنے کی ہدایات دی جائیں لیکن ورونٹسوف نے اس کے برعکس رسد کے آنے تک وہیں انتظار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

دارگو میں ۶۰۰ کے قریب رُوسی بھگوڑے سپاہی موجود تھے۔ ان سپاہیوں نے روسی افواج کو چڑانے کے لیے دارگو کے پہاڑوں پر روز شام کے وقت ٹیٹو کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ یہ صورتحال روسی افواج کے لیے خاصی حوصلہ شکن تھی۔ انھی کی فوج کے بھاگے ہوئے سپاہی امام شاملؒ کے ساتھ مل کر ان کی بے بسی کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ امامؒ نے پہاڑ کی بلندی پر چار توپیں نصب کروادی تھیں جو وادی میں گولے برساتی رہتی تھیں۔ اس صورت حال کے ازالے کے لیے جنرل لینسٹوف ۸ جولائی کی صبح کو مجاہدین پر حملہ آور ہُوا اور یہ حملہ خاصا کامیاب رہا۔ نیچے وادی میں روسی افواج اپنے ساتھیوں کی کامیابی پر شاداں تھیں لیکن جب حملہ آور فوج واپس ہوئی تو یہ خوشی رنج وغم میں بدل گئی۔ واپسی کا راستہ مکئی کی فصلوں، جھاڑیوں اور درختوں سے ہوکر گزرتا تھا اور جب رُوسی افواج واپس ہونے لگیں تو ہر بڑے پتھر اور درخت کی اوٹ سے مجاہدین روسی افواج پر ٹوٹ پڑے۔ یہ کالم جب کیمپ واپس پہنچا تو ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد ۱۸۷ تک پہنچ چکی تھی، مجاہدین نے اپنے مورچے دوبارہ سنبھال لیے تھے اور بھاگے ہُوئے رُوسی سپاہی بلندیوں پر بدستور صبح وشام ٹیٹو کا مظاہرہ کررہے تھے۔

(روسی فوج کی پسپائی کے لمحات خاصے یاس انگیز تھے پیش آنے والے خطرات کے سائے منڈلا رہے تھے۔) وہی چہرے جو اس سے پہلے خوش وخرم تھے اچانک غمگین سے ہوگئے۔ یہ رنج والم ۲۰۰ کے لگ بھگ ہلاک اور زخمی سپاہیوں کی وجہ سے نہیں تھا۔ اس قسم کے حادثات پیش آتے ہی رہتے تھے، لیکن یہ احساس کہ یہ سب قربانیاں رائیگاں گئیں فوج کے حوصلے پست کیے دے رہا تھا۔ ہلاک ہونے والے سپاہیوں کے قبروں میں اُتارے جانے کے وقت توپیں داغی جاتی تھیں لیکن اس سے امامؒ اور ان کے ساتھیوں کو مقتولین کی تعداد کا پتہ چل

جاتا تھا اور ساتھ ہی بارود بھی ضائع ہو رہا تھا اس لیے انھیں خاموشی سے دفن کیا جانے لگا۔

۹ جولائی کی رات کو جنگل کے کنارے سے توپوں کی آواز سے معلوم ہو گیا تھا کہ رسد پہنچ چکی ہے، لیکن مشکل مسئلہ یہ تھا کہ یہ رسد فوج کی مدد کے بغیر دارگو نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اس رسد کو دارگو پہنچانے کی مہم جو خاصی ناکام رہی "بسکٹ مہم" کے نام سے مشہور ہے۔

ورونٹسوف نے اس مہم کو منظم کیا یا گورکو نے، اس بات کا ہمیں علم نہیں۔ لیکن یہ بات ضرور علم میں آئی ہے کہ کلنگو نے اس مہم پر اعتراضات کیے۔ کسی کے ذہن میں یہ بات آئی کہ چونکہ یہ سامانِ رسد سب یونٹوں کے لیے ہے اس لیے ساری یونٹیں اپنا اپنا حصہ لانے کے لیے اپنے نصف فوجیوں کو بھیجیں اس کالم کی کمان کلنگو کے سپرد کی گئی۔ پیش قدمی کرنے والے دستے کی کمان پاسک کے سپرد تھی اور پچھلے دستوں کی کمان وکٹوروف کے ہاتھ میں۔ اس کالم میں مختلف یونٹوں سے آئے ہوئے چار افراد تھے اور یہی بات اس کے حق میں مضر تھی۔ کیونکہ یہ دست بدست جنگ میں اچھا کردار ادا کرنے کے قابل نہ تھے۔ کالم ۱۰ جولائی کی صبح روانہ ہُوا اور اس راستے سے واپس ہونے کا ارادہ تھا جس کے چار پانچ میلوں کے بارے میں پہلے بھی بتایا جا چکا ہے۔ اب پہلی رکاوٹیں اور زیادہ مضبوط بنا دی گئی تھیں جو انتہائی دشواری سے ہٹائی جا سکیں۔ پاسک دو بٹالین انجینئر اور نشانہ بازوں کی ایک ایک کمپنی اور توپ خانے کی دو توپوں کو ہمراہ لیے، رکاوٹوں کو عبور کرتا، تیزی سے آگے بڑھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہُوا کہ فوج کا اگلہ حصہ درمیانی حصے سے اور درمیانی حصہ پچھلے حصے سے الگ ہو گیا۔ مریدین درمیانی حصوں پر قابض ہو گئے اور پھر ہر پتھر، ہر درخت حتّٰی کہ ہر شاخ کے پیچھے سے نکل نکل کر دشمن کا صفایا کرتے گئے، تنگ درّے کے قریب شدید جنگ ہوئی اور رات گئے تک جاری رہی۔ جنرل وکٹوروف اور دوسرے کئی افسر اور سپاہی مارے جا چکے تھے۔ بڑی تعداد میں سپاہی زخمی ہو چکے تھے اور جنرل فوک کی نعش جو شورا لے جائی جا رہی تھی، وہ بھی کسی گہرے نالے میں پھینکی جا چکی تھی۔

صورت حال خاصی ابتر تھی لیکن شاید اسے ابھی اور زیادہ خراب ہونا تھا۔ کلنگو کا یہ خیال تھا کہ یہیں سے داغستان کی طرف سے ہوتے ہوئے پسپائی اختیار کی جائے اور ورونٹسوف کو اپنی

فوجوں کے ہمراہ لڑتے ہوئے غرزل کی طرف پسپائی اختیار کرنی چاہیے لیکن تیسری دفعہ زخمیوں اور بیماروں کے ہمراہ اس تنگ درے کو عبور کرنے میں کہیں زیادہ نقصانات کا اندیشہ تھا۔ اس نے چیف کو لکھا بھی لیکن پھر اسے اپنی اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس ستانے لگا۔ ساتھ ہی پاسک کا بھی اصرار تھا کہ چیف کو لے کر دوبارہ واپس آیا جائے۔ نتیجتاً ایک بار پھر ایک ہرکارہ روانہ کیا گیا کہ کالم صُبح چل کر شام تک پہنچ جائے گا۔ ورونٹسوف یہ پیغام سُن کر اس قدر خوش ہوا کہ اس نے وہیں ہرکارے کی ترقی کے احکامات جاری کر دیے۔

۱۱ جولائی کی صبح کو یہ کارواں چل پڑا اور دارگو والوں کو توپ کے تین گولے چھوڑ کر اس کی روانگی کی اطلاع دے دی گئی۔ اس بار مجاہدین پہلے سے کہیں زیادہ تھے نیز روسیوں کو ایک اور مشکل درپیش تھی۔ رات کو مُوسلادھار بارش ہُوئی تھی اور رستہ چلنا اور زیادہ دشوار ہو گیا تھا۔ پاسک اس بار پھر پیش قدمی کرنے والے دستوں کی کمان کر رہا تھا۔ جب وہ تنگ درّے کے پاس پہنچا تو وہاں اسے پچھلے دن کے ہلاک شدہ روسیوں کی لاشوں کا ڈھیر نظر آیا۔ اس ڈھیر کے پیچھے کوئی متنفس موجود نہیں تھا لیکن اس کے دائیں بائیں دو ایسے مورچے تھے جس پر قبضہ کیے بغیر آگے پیش قدمی ممکن نہ تھی۔ پاسک نے دو کمپنیاں بھیجیں لیکن اُس سے پیشتر کہ ان مورچوں کو تباہ کیا جا سکتا، ان کمپنیوں کا کمانڈر ہلاک ہو گیا اور انھیں بھاری نقصان اُٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔ بائیں جانب دو کمپنیوں کو لے کر پاسک خود بڑھا لیکن وہیں مارا گیا اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ اس کے پاس کوئی سپاہی موجود نہ تھا۔

جب انجینئرز [1] کے سپاہی ان رکاوٹوں کو ہٹانے کے لیے گئے تو وہ سب مجاہدین کے ہاتھوں مارے گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے تھکے ہارے سپاہی بسکٹوں کے بوجھ سے لدے ہُوئے آ رہے تھے۔ زخمیوں میں اضافے کی وجہ سے مشکلات اور زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ کلنگو نے اس موقع پر غیر معمولی شُجاعت کا ثبوت دیا۔ وہ کسی عام افسر کی طرح کمپنیوں کو ساتھ لیے حملہ کرتے ہوئے

---

[1] انجینئرز فوج کے اس حصے پر مشتمل ہوتے ہیں جس کا کام بارودی سرنگیں بچھانا، انھیں صاف کرنا، پلوں کی تعمیر کرنا اور انھیں گرانا اور سڑکوں کی تعمیر ہوتا ہے۔

آگے بڑھتا گیا۔ اس دوران مجاہدین نے اپنی گوریلا کارروائیاں جاری رکھیں۔ وہ فائرنگ کرتے رہتے تھے اور موقع پاتے ہی رُوسیوں پر ٹوٹ پڑتے اور آن کی آن میں انھیں ہلاک کر کے جنگل میں دوبارہ چھُپ جاتے۔

۱۰ اور ۱۱ جولائی کے نقصانات یہ تھے ۲ جنرل ۱۱۷ افسر اور ۵۳۷ سپاہی ہلاک ہو چکے تھے۔ ۱۳۲ افسر اور ۳۸۷ سپاہی زخمی ہو گئے تھے۔ ۳ توپیں مجاہدین نے چھین لی تھیں اور وہ سامان رسد جس کے لیے یہ سب قربانیاں دی گئی تھیں، پھر بھی دارگو نہیں پہنچ سکا تھا۔ ورونٹسوف کی فوج کی تعداد اب صرف ۵۰۰۰ رہ گئی تھی۔ ۱۱۰۰ سپاہی زخمی تھے اور کھانے پینے کا سامان نہ ہونے کے برابر تھا۔ ابھی مزید ۲۸ میل کا سفر مجاہدین کے نرغے میں لڑتے بھڑتے طے کرنا تھا۔

یہ سفر خیریت سے طے ہوتا نظر نہیں آتا تھا اور ورونٹسوف کو اس بات کا اچھی طرح احساس بھی تھا۔ بچنے کا صرف ایک طریقہ تھا اور وہ یہ کہ فرٹیگ اس موقع پر کمک لے کر پہنچے اور کسی طرح اس کالم کو مکمل تباہی سے بچا لے۔ پانچ مختلف ہرکارے یہ پیغام لے کر گروزنی روانہ ہوئے کہ ''اگر مدد نہ پہنچی تو اس کالم کا ایک شخص بھی زندہ سلامت نہ بچ سکے گا'' فرٹیگ اس سے پہلے اس مہم کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کر چکا تھا۔ اسے پہلے ہی سے اس قسم کی صورت حال کی توقع تھی۔ اس نے کسی حد تک انتظامات بھی مکمل کر لیے تھے۔ اسے یہ پیغام ملا تو وہ فوراً روانہ ہو گیا۔

### رُوسیوں کی حالتِ زار:

اسی دوران اس کالم کی جو حالت ہُوئی ہو گی اس کا اندازہ پہلے بیان کردہ واقعات سے ہو سکتا ہے۔ تمام خیمے اور ایسے سٹور جلا دیے گئے تھے جن کی ضرورت نہ تھی۔ زخمیوں کو لے جانے کے انتظامات مکمل کرنے کے بعد ۱۳ جولائی کی صبح کو روانگی شروع ہو گئی۔ راستے بھر لڑائی ہوتی رہی۔ دو دنوں میں ۷ افسر اور ۷۰ سپاہی ہلاک ہو گئے اور زخمیوں کی تعداد میں مزید ۲۴ افسروں اور ۲۲۵ سپاہیوں کا اضافہ ہو گیا۔ پورے کالم میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ ہراول دستے تیز رفتاری کی وجہ سے درمیانی حصے سے منقطع ہو جاتے اور مجاہدین کو ان پر ہاتھ صاف کرنے کا موقع مل

جاتا۔ ۳۰ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ان سپاہیوں کا حال ایسا ہو رہا تھا جیسے زخمی خرگوش تعاقب سے تھک ہار کر کسی کونے میں پڑا ہانپ رہا ہو۔ دارگو سے یہاں پہنچتے پہنچتے ۱۰۰۰ سپاہی سفر کی نذر ہو چکے تھے اور غرزل ابھی دس میل دور تھا۔ کالم اب تک ایک دن میں ۴ میل سے زیادہ سفر طے نہیں کر سکا تھا۔ زخمیوں کی تعداد ۲ ہزار تک جا پہنچی تھی اور ہر تین افراد کو ایک زخمی کا بوجھ اٹھانے کے علاوہ تمام راستے لڑنے، راستے کی رکھوالی کرنے اور دوسرے کاموں سے بھی نبٹنا تھا۔ بھوک کے مارے الگ بُرا حال ہو رہا تھا۔

ورونٹسوف نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اب مزید سفر بالکل بے سُود ہوگا۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ فرٹیگ کا انتظار کرے گا۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ آیا اس کا پیغام فرٹیگ تک پہنچا بھی ہے یا نہیں۔ ۱۷ جولائی کا پُورا دن اسی تذبذب میں گزر گیا۔ توپوں کا ایک گولہ بھی باقی نہ بچا تھا۔ کھانے کے لیے چند مُٹھی مکّی سے زیادہ اور کچھ نہ تھا اور دوسری طرف امام شامل تمام دن کیمپ پر گولہ باری کرواتے رہے تھے۔ ۱۸ تاریخ آ پہنچی اور اب بھی کسی قسم کی اطلاع نہیں آئی تھی۔ پوری فوج فاقے میں مبتلا تھی۔ زیادہ سے زیادہ ایک یا دو دن مزید انتظار کیا جا سکتا تھا۔ اس موقع پر رُوسی جنرل پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ اس حد تک دل برداشتہ ہو چکا تھا کہ اس نے زخمیوں کو وہیں بے یار و مددگار چھوڑنے اور غرزل تک لڑتے بھڑتے پہنچنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ بات درست نہ بھی ہو تو بھی یہ حقیقت ہے کہ صورت حال اتنی نازک ہو چکی تھی کہ بہت سے لوگ اس حد تک بھی آمادہ ہو چکے تھے کہ وہ اس شرمناک صورتِ حال کو قبول کر لیں اور زخمیوں کو مجاہدین کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اپنی جان بچانے کی کوشش کریں۔

۱۸ جولائی کا دن بھی یونہی گزر گیا۔ سپاہی بھُوک سے جاں بلب تھے۔ گولہ بارود بالکل ختم ہو چکا تھا۔ سُورج ڈھلنے کو تھا اور یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ آخری رات آن پہنچی ہے لیکن اسی دوران دور سے توپوں کے گولوں کی آواز لحظہ بہ لحظہ قریب آتی جا رہی تھی۔ یہ یقیناً روسی توپوں کی آواز تھی۔ فرٹیگ پہنچ رہا تھا۔ کچھ دیر کے لیے زخمیوں کو اپنی تکلیف بھُول گئی۔ تمام فوج میں جینے کا حوصلہ پھر سے جاگ اٹھا۔ ۱۹ جولائی کی صبح کو فرٹیگ کا کالم آن پہنچا اور ۲۰ جولائی کو اس مہم کا

باقی ماندہ حصہ غرزل پہنچ گیا۔ آخری دن کے نقصانات یہ تھے: ۱۳ افسر اور ۸۷ سپاہی ہلاک، ۱۸ افسر اور ۱۳۹ سپاہی زخمی ہوئے تھے۔ ورونٹسوف کی فوج کا کل نقصان یہ تھا: ۳ جنرل، ۱۹۵ افسر اور ۳۳۴۳ سپاہی ہلاک اور زخمی۔ علاوہ ازیں تین توپیں ضائع ہو گئی تھیں۔

یہ تھا ۱۸۴۵ء میں وارگو کی مہم کا حسرت ناک انجام۔

چی گویرا نے دارگو کی مہم کے تقریباً ۱۰۰ سال بعد جو کچھ کہا وہ مندرجہ بالا واقعات سے کس حد تک مطابقت رکھتا ہے، اس کا اندازہ آپ خود کیجیے۔ وہ لکھتا ہے:

''گوریلا لڑاکے کو میدان جنگ کا اچھی طرح علم ہوتا ہے، جب کہ حملہ آور کالم کو اس علاقے کے بارے میں تفصیلی طور پر علم نہیں ہوتا۔ گوریلا لڑاکے رات کو کالم پر جھپٹتے ہیں اور دشمن کو رات کی آمد کا شدید خوف رہتا ہے۔ مسلسل کارروائیوں کی مدد سے دشمن کو ناقابلِ تلافی نقصانات پہنچائے جا سکتے ہیں۔ دشمن کے ہراول دستے پر ہمیشہ حملہ کرنا چاہیے۔ اس پر نفسیاتی اعتبار سے اس طرح کا خوف مُسلط کر دینا چاہیے۔ کہ ہراول دستے میں شامل ہر فرد اپنی موت کو یقینی سمجھ بیٹھے۔ اس طرح وہ وقت آ پہنچے گا جب کہ کوئی فرد بھی ہراول دستے میں رہنے کے لیے تیار نہیں ہو گا۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ہراول دستے کے بغیر کوئی کالم پیش قدمی نہیں کر سکتا۔''

(''گوریلا جنگ'' صفحہ ۷۶)

## باب ہشتم:

# حاجی مراد رحمہ اللہ

دارگو کی مہم ناکام ہو چکی تھی اور اس موقع پر ورنٹسوف شہنشاہ کو صرف ایک تسلّی دے سکتا تھا اور وہ یہ تھی کہ "کوہستانیوں کو یہ پتہ چل گیا ہے کہ ہم ان مقامات تک بھی پہنچ سکتے ہیں جو اس سے پہلے ناقابلِ عبور سمجھے جاتے تھے۔" یہ عجیب بات ہے کہ کوہستانِ سیاہ کی مہمات (۱۸۸۸ء) کے دوران نقصانات اور ناکامی پر برطانوی جنرل نے وائسرائے کو جو رپورٹ بھجوائی تھی اس کے الفاظ بھی ہُو بہو یہی تھے۔ ❶

### مریدیّت کا استحکام:

امامؒ روسیوں کو زک پہنچانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اس فتح کی وجہ سے پُورے داغستان اور چیچنیا میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ مریدیت کے اثرات روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔ پوار قفقاز رُوسیوں کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مغربی محاذ پر امامؒ نے اپنے ایک مرید محمد امین کو داغستان سے بھیجا تھا جنھوں نے اس علاقے میں رُوسیوں کے بڑے بڑے لشکروں کو شکستیں دی تھیں۔ پورے قفقاز میں مجاہدین کی خبریں حیرت انگیز طور پر ایک جگہ سے دوسرے جگہ پہنچ جاتی تھیں۔ ایک محاذ پر کامیابی سے دوسرے محاذ پر مجاہدین کے حوصلے بلند ہو جاتے تھے۔ اور ایک جگہ کی ناکامی دوسرے جگہ اثر انداز ہوتی تھی۔

۱۸۴۰ء میں بحیرۂ اسود کے پاس رُوسیوں کے قلعوں کی تباہی کے اثرات امامؒ کے حق میں خاصے اچھے ثابت ہوئے تھے۔ اخالگو کے محاصرے کے بعد امامؒ انھی کامیابیوں کی وجہ سے اپنا اثر و رسوخ بحال کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ مختلف محاذوں پر لڑنے والے مجاہدین کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر ایک جگہ شکست کا سامنا کرنا پڑا اور رُوسیوں کو مکمل فتح ہوگئی تو وہ اپنی پُوری

---

❶ 1888 Expedition of Black Mountains by Gen.Mc Queen.

طاقت دوسرے محاذ پر جھونک دیں گے۔ان کے بچاؤ کا واحد ذریعہ یہی تھا کہ وہ روسیوں کی طاقت کو دو مختلف محاذوں پر مصروف رکھیں اور اس طرح ایک دوسرے کی مدد سے دشمن کا سر کچل دینے میں کامیاب ہو سکیں۔یہی وجہ ہے کہ امامؒ کی یہ دلی خواہش تھی کہ مغربی محاذ پر جنگ جاری رہے۔

## مغربی محاذ پر جنگ:

گریب کی افواج کو شکست فاش دینے کے بعد امامؒ پوری طرح سے اس محاذ جنگ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ان کا منصوبہ یہ تھا کہ بحیرۂ کیسپین سے بحیرۂ اسود تک تمام مسلمان روسیوں کے چنگل سے نجات حاصل کر کے آزادی کی زندگی گزار سکیں۔مشرق میں قفقاز سے لے کر کیسپین کے ساحلوں تک پہلے ہی مریدیت کی تحریک کے اثرات کچھ زیادہ نہیں تھے۔پھر بھی ایک بات حوصلہ افزا تھی اور وہ یہ کہ وسطی علاقے کے کبارڈا کے جنگجو قبائل جنھوں نے ۱۸۲۲ء سے رُوسی اطاعت قبول کر رکھی تھی اب کسی حد تک غیر مطمئن تھے اور روسی غلامی سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔اگر کہیں کبارڈا کے لوگ ہتھیار اٹھانے کے لیے تیار ہو جاتے تو نہ صرف یہ کہ مشرق اور مغرب آپس میں مل سکتے تھے بلکہ امامؒ کی قوت میں بھی بے پناہ اضافہ ہو سکتا تھا۔دوسری طرف روس کے لیے اس متحدہ قوت کا مقابلہ کرنا قریباً ناممکن ہو جاتا۔ان خدشات کا اظہار خود ورونٹسوف نے بھی وزیر جنگ کے نام ایک مراسلے میں کیا۔اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے رُوسیوں کو شاید پہلے سے بھی زیادہ بڑی تعداد میں قربانیاں دینی پڑتیں۔۱۸۴۶ء کے آغاز میں امام شاملؒ کی نمایاں کامیابیوں سے متاثر ہو کر کبارڈا کے کچھ سر برآوردہ شہزادوں نے امامؒ سے ان کے یہاں آنے کی التماس کی۔امامؒ اس موقع کے انتظار ہی میں تھے اور انھوں نے جلد ہی اپنے مریدوں کے ہمراہ چلنے کی تیاریاں کر لیں۔

مریدوں کے دستوں کی تیاریوں کا حال عام حالات میں چھپانا خاصا مشکل کام تھا۔دونوں اطراف سے جاسُوس برابر اطلاعات پہنچانے میں مصروف رہتے۔دونوں جانب سے کسی قسم کے اقدام کی اطلاع فوراً ہو جایا کرتی تھی اور بسا اوقات ہر روز کی کارروائی دوسرے کیمپ میں پہنچ جاتی تھی۔اس سے پہلے یہ ذکر آ چکا ہے کہ ورونٹسوف کے ذاتی مُلازم نے دارگو پر

چڑھائی کے موقع پر پہلے ہی سے امامؒ کو اطلاعات پہنچا دی تھیں۔ امامؒ کا جاسوسی نظام خاصا کامیاب تھا۔ کسی خاص مقام پر روسی افواج کے اجتماع سے حملے کا مقصد اور مقام عام طور پر واضح ہو جایا کرتا تھا۔ کیونکہ رُوسیوں کی دفاعی لائن چھپی ہوئی نہیں تھی۔ لیکن امامؒ کا معاملہ مختلف تھا۔ ان کو یہ سہولت تھی کہ وہ روسیوں کی دفاعی لائن سے کافی دُور اپنے علاقے ہی میں بیٹھ کر ہر قسم کی منصوبہ بندی کو نہ صرف خُفیہ رکھ سکتے تھے بلکہ دشمن کو حملے کے مقام کے بارے میں بھی شکوک میں مُبتلا کر سکتے تھے۔ وہ مختلف جگہوں سے دشمن پر حملے کرنے کے علاوہ دشمن کو آخر وقت تک اپنے ارادوں کے بارے میں پتہ نہیں چلنے دیتے تھے۔ موجودہ صورتِ حال میں بھی وہ ارگوٹنکی اور حتّٰی کہ ورونٹسوف تک کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ وہ وسطی داغستان میں اخوشیا کے مقام پر پہنچنے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ رُوسی کمانڈر انچیف اس بارے میں اتنا مطمئن تھا کہ وہ خود جنوب میں شیما خا کے مقام پر بیٹھا رہا اور اس نے فرٹیگ کو حکم دیا کہ وہ پانچویں کور کی وطن واپسی کے کام میں کسی قسم کی تاخیر نہ کرے۔

اپریل کے شروع میں گروزنی کے مقام پر فرٹیگ کے کان میں کسی طرح یہ بھنک پڑ گئی تھی کہ مریدین کا مقصد اس بار کچھ اور ہی ہے۔ اس نے سینٹ پیٹرز برگ کے احکامات اور ورونٹسوف کے حالیہ احکام کے باوجود جنرل ہیسفورٹ سے کہا کہ وہ وطن واپسی کے ارادے کو ملتوی کر کے دو بٹالینوں کو قفقاز سے ۳۰ میل شمال مغرب میں تریک کے مقام پر لے آئے۔ اس نے دُوسری طرف کزلیر کے مقام پر پہلے ہی دو بٹالینیں متعین کر کے ہر قسم کے غیر متوقع حالات کی پیش بندی کر دی اس میں شک نہیں کہ فرٹیگ نے اپنی طرف سے خاصے انتظامات کر لیے تھے۔ لیکن دُوسری طرف اسے یہ اطلاعات بھی مل رہی تھیں کہ امامؒ کی افواج کی تعداد اس کی فوج سے دوگنی ہے اور ان کے متحرک دستے رُوسی افواج کو خاصا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

حالیہ شکستوں کے بعد رُوسی افواج کے مورال [1] کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دُوسری

---

[1] عزم، ہمت، حوصلہ، ذہنی کیفیت، لفظ مورال ''Moral'' عام طور پر فوج میں استعمال ہوتا ہے اور ایک جامع لفظ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے سپاہی اس کے کسی متبادل کی نسبت اس سے کہیں زیادہ متعارف ہیں۔

طرف مریدین کی حالیہ فتوحات کی وجہ سے ان کے جوش وخروش میں بھی کوئی کمی نہ تھی۔ امامؒ کی افواج کی تعداد سونجہ عبور کرنے کے بعد چودہ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اس میں سے بھاری اکثریت سواروں کی تھی اور ان کے ہمراہ آٹھ میدانی توپیں بھی تھیں۔ اسلحہ بارُود بھی خاصی تعداد میں تھا اور گھوڑوں کی تعداد بھی کافی تھی۔

اس حوصلہ شکن صورت حال کے باوجود جنرل فرٹیگ نے ہر ممکن تیاری کر لی تھی اور وہ شہنشاہ کی حکم عدولی تک کا خطرہ مول لینے پر آمادہ تھا۔ اب وہ نتائج کا منتظر تھا۔ امامؒ اور فرٹیگ کی افواج آنے والے دنوں میں آنکھ مچولی کھیلتی رہیں۔

### کبارڈا والوں کی غداری:

امامؒ کبارڈا پہنچے تو وہاں کے رہنے والوں نے روسی افواج کے خوف سے امامؒ کا ساتھ دینے سے گریز کیا۔ کبارڈا کے لوگوں کی غداری کی وجہ سے اور فرٹیگ کے بروقت اقدامات کے باعث امامؒ کو اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی لیکن اس تمام مہم کے واقعات کے مطالعے سے ایک بات کا اندازہ ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ہر جگہ امامؒ اور ان کی افواج فرٹیگ کو جُل دے کر آگے بڑھ جاتی تھیں۔ امامؒ نے جس ہنرمندی سے اپنی افواج کو مقابلے سے محفوظ رکھا تھا اور جس طرح وہ ہر مشکل مقام پر بچ نکلے تھے، وہ ان کی عظیم فوجی قابلیت کا ثبوت ہے۔ فرٹیگ نے کئی جگہ ناکہ بندی کر رکھی تھی لیکن وہ کفِ افسوس ملتا رہ گیا۔ فرٹیگ کی پیش بندیوں کا رُوسیوں کو یہ فائدہ ضرور ہُوا کہ کبارڈا میں امامؒ کو فتوحات نصیب نہیں ہو سکیں۔ لیکن امامؒ کے دستوں کے بچ نکلنے کی وجہ سے امامؒ کی شُہرت کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا۔ دوسری طرف کبارڈا کی مہم میں جو ناکامی پیش آئی اس کا باعث کبارڈا والوں کی غداری کو ٹھہرایا گیا۔

باقی سال کے دوران بھی مریدین نے رُوسیوں کو آرام نہیں لینے دیا۔ چیچنیا میں تو انھوں نے بڑھ بڑھ کر حملے کیے۔ گروزنی اور دوزڈ ینکو کے شہروں تک پر گولہ باری کی جاتی رہی۔ دُوسری طرف رُوسیوں نے فوجی اہمیت کی سڑکیں اور قلعے بھی بنانے شروع کر دیے تھے۔ حاجی مراد نے اسی اثناء میں غمری سے واپسی کے موقع پر شورا کی چھاؤنی پر حملہ کر کے ۱۵۸ گھوڑے

اور ۱۸۸ مویشی چھین لیے اور ۲۰ روسیوں کو ہلاک کر دیا۔ یہ سال نسبتاً خاموش گزرا تھا لیکن قفقاز میں متعین فوج کو اس سال بھی ۱۵۰۰ ہلاک یا زخمی افسروں اور سپاہیوں کا نذرانہ امامؒ کی خدمت میں پیش کرنا پڑا۔

## امامؒ کے حفاظتی اقدامات:

۱۸۴۷ء کے پہلے تین ماہ امامؒ دارگو ویدین میں مقیم رہے ابھی تک انھوں نے کسی با قاعدہ مہم کا ارادہ نہیں کیا تھا لیکن مارچ کے اواخر میں ایک انتہائی روشن دُم دار ستارہ نظر آیا اور اسی رات روسی بھگوڑوں کے گھر کو آگ لگ گئی اور وہ جل کر راکھ ہو گیا۔ ان واقعات کی امامؒ نے یہ توجیہہ کی کہ جہاد کا وقت آن پہنچا ہے اور یہ کہ رُوسیوں کی طاقت ملیامیٹ ہو جائے گی۔ امامؒ نے اپنے طوفانی دستوں کو تیار ہونے کے احکامات دے دیے۔ دُوسری طرف رُوسیوں کا ارادہ یہ تھا کہ غرغیبل، سالتی، سوگراتل اور اریب کے دیہات پر قبضہ کر لیں۔ امامؒ نے ان تمام مقامات پر مکمل حفاظتی انتظامات کر رکھے تھے۔

## غرغیبل کا محاصرہ:

غرغیبل کی دفاعی پوزیشن قدرت نے پہلے ہی محفوظ بنا رکھی تھی۔ چاروں طرف سے پہاڑوں کے بیچ میں گھرے ہوئے اس مقام کو مصنوعی دفاعی انتظامات کے ذریعے مزید مضبوط بنایا گیا تھا۔ ہر جانب پتھروں کے با قاعدہ مورچے تھے اور پھر اس کے گرداگرد ۱۴ فٹ اُونچی اور ۵ فٹ چوڑی دیوار بنائی گئی تھی جس پر خاردار جھاڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ دو طرف برج بنائے گئے تھے جن پر چھوٹی توپیں رکھی ہوئی تھی۔ ہر گھر میں جھروکے بنے ہوئے تھے جن میں سے بندوقوں کا فائر کیا جا سکتا تھا۔ گاؤں کے اندر بھی جگہ جگہ مختلف رکاوٹیں کھڑی کی گئی تھیں۔ رُوسیوں کو (ایک انتہائی اہم بات کے علاوہ) ان سب انتظامات کا علم اپنے جاسوسوں کے ذریعے سے ہو چکا تھا۔

پرنس ورونٹسوف یکم جُون کو داغستان اور سمور کی ڈویژن کی کمان کرتے ہوئے غرغیبل پہنچ گیا تھا۔ یہاں پہنچ کر اس نے توپ خانے کو ایک نسبتاً آسان جگہ پر فائر کھول دینے کا حکم دیا۔

۲ جون کو باغات پر رُوسی قبضہ ہو چکا تھا۔ یہاں انھیں قطعاً مزاحمت پیش نہیں آئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہاں کے دفاع کے ذمہ دار مریدین میں طاعون پھیل گیا تھا۔ ۳ جون کو فصیل میں شگاف پڑ چکا تھا اور چونکہ بہت زیادہ مقابلہ پیش نہیں آیا تھا اس لیے ورنتسوف نے عام حملے کا حکم دے دیا۔

اسی دوران پہاڑوں پر مرید افواج کی نقل وحرکت خاصی بڑی تعداد میں دیکھی گئی اور بیچوں بیچ مریدین کے سفید خیمے بھی نظر آئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خیمے امامؒ کے لیے لگائے گئے تھے تھوڑی دیر میں امامؒ خود تشریف لے آئے۔ وہ اس لیے آئے تھے کہ ان کی موجودگی کی وجہ سے مریدین کے حوصلے بڑھ جائیں اور وہ رُوسیوں کو پیچھے دھکیلنے اور انھیں تباہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

رُوسیوں کا حملہ:

۴ جون کی صبح کو ۶ بجے رُوسی افواج کے ایک کالم نے وڈوکیموف کی قیادت میں مریدین کی توجہ اپنی طرف مبذول کروانے کے لیے حملہ کیا اور دُوسرا کالم پرنس اور بلیانی کی قیادت میں اصل حملے کے لیے آگے بڑھا۔ مریدین کی دو توپیں گولے برسا رہی تھیں لیکن ان میں سے ایک خاموش ہو گئی تھی اور مزاحمت زیادہ شدید نہیں تھی۔ دُوسری طرف رُوسی توپیں شگاف کو مزید بڑا کر رہی تھیں۔ ووڈوکیموف شگاف میں سے اپنے سپاہیوں کو لے کر آگے بڑھا لیکن آن کی آن میں سیکڑوں بندوقوں نے بیک وقت فائر کھول دیا اور رُوسی سپاہی گھاس کی طرح کٹ کر گر پڑے۔ وڈوکیموف کا جسم بھی کئی گولیوں سے چھلنی ہو چکا تھا۔ گرینڈ پر کمپنی کا کیپٹن آگے بڑھا لیکن اس کا انجام بھی یہی ہوا۔ ایک اور افسر آگے بڑھا اور دیوار فتح ہو گئی۔ اب تک نقصانات خاصی بڑی تعداد میں ہوئے تھے لیکن رُوسیوں کو یہ اُمید تھی کہ وہ اس معرکے کو جیت لیں گے۔ سامنے ہی چھوٹے مورچے تھے، انھیں عبور کرتے ہوئے رُوسی سپاہی تیزی سے آگے بڑھے لیکن ان کے تعجّب کی انتہا نہ رہی جب اُنھیں معلوم ہُوا کہ زمین ان کے نیچے سے سرک رہی ہے چشم زدن میں وہ سب کے سب نیچے آن پڑے اور ساتھ ہی ہر جانب سے مریدین ان پر ٹوٹ

پڑے۔ مکانوں کی چھتیں اکھاڑ کر ان کی جگہ جھاڑیاں بچھا دی گئی تھیں اور ان پر مٹی بھی ڈال دی گئی تھی۔ رُوسیوں کو موت کے ان گڑھوں کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ ہر گھر حقیقت میں ایک گڑھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں پورے کا پُورا کالم یہاں گھر کر رہ گیا۔ بڑی مشکل سے کچھ سپاہی زخمی افسروں کو لے کر شگاف سے باہر جا سکے۔ رُوسی سپاہیوں کا غیظ و غضب دیکھنے کے قابل تھا۔ ایک بار پھر حملہ کیا گیا اور ایک بار پھر مریدین نے انھیں نکال باہر کیا۔

یہ حملہ اگرچہ بڑی بہادری سے کیا گیا تھا لیکن پھر بھی ناکام رہا اور رُوسیوں کو بھاری تعداد میں جانی نقصانات اٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔ ان کے ۳۶ افسر اور ۵۸۱ سپاہی ہلاک اور زخمی ہوئے مزید چار دن تک محاصرہ جاری رہا لیکن توپخانے کی گولہ باری کے سِوا اور کُچھ نہیں کیا گیا۔ ہر رات مجاہدین پہاڑوں سے نیچے اُترتے اور رُوسیوں کے کیمپ کو نقصان پہنچا کر دوبارہ اُوپر پہنچ جاتے۔ رُوسیوں کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ انھیں پسپائی کے لیے بہانہ چاہیے تھا۔ اسی دوران ہیضہ پھُوٹ پڑا اور رُوسیوں کو واپسی کا عُذر مل گیا۔ ورونٹسوف نے محاصرہ اُٹھا لیا اور قاضی قاموخ کے دریا کی بالائی جانب پسپا ہو گیا۔

### لتی میں رُوسی نقصانات:

ورونٹسوف نے اب تمام تر توجہ سالتی کی طرف مرکوز کر دی۔ محاصرے کے لیے بھاری تعداد میں ساز و سامان مہیا کیا اور ۷ ہفتوں کے مسلسل محاصرے کے بعد، جس میں دونوں فریقوں نے خوب دادِ شجاعت دی۔ بالآخر تیسری بار حملے کے بعد سالتی پر قبضہ ہو گیا۔ یہ جگہ غرغیبل سے بھی زیادہ مضبوط تھی جنگ میں روسیوں کے ۲۰۰۰ کے لگ بھگ افسر اور سپاہی ہلاک اور زخمی ہوئے۔

ایک سال بعد (۱۸۴۷ء کے جون میں) ورونٹسوف نے آرگوٹسکی کو ۱۰ ہزار سپاہیوں کی کمان دے کر غرغیبل بھیجا۔ محاصرہ ۲۳ دن جاری رہا۔ بالآخر مختلف مقامات سے چھوٹی بڑی ۴۶ توپوں سے دن رات کی گولہ باری کی وجہ سے محصور مریدین نے رات کی تاریکی میں اس جگہ کو خالی کر دیا۔ اس محاصرے کے دوران روسیوں نے گاؤں پر ۱۰ ہزار گولے برسائے۔

روسیوں کے ۴ افسر اور ۶۷ سپاہی ہلاک اور ۵۰۰ سپاہی زخمی ہوئے۔ تقریباً ایک ہزار مجاہدین اس موقع پر شہید ہوئے ہوں گے لیکن روسیوں کو اس فتح سے کوئی قابل ذکر فائدہ نہیں پہنچا۔ وہ غرغیبل پر اپنا قبضہ برقرار نہ رکھ سکتے تھے اور جب وہ واپس جانے لگے تو مریدین نے دُور تک اُن کا تعاقُب کیا۔ امام شاملؒ نے غرغیبل کی بجائے ایک اور جگہ پر مضبوط قلعہ بنایا جو اولو قلعہ کے نام سے مشہور ہُوا۔

## آختی کا محاصرہ:

۱۸۴۸ء میں آختی ❶ کے قلعے میں کرنل اوتھ کی قیادت میں ۵۰۰ رُوسی سپاہیوں نے ایک ہفتے تک مریدین کا مقابلہ کیا۔ امام اور اُن کے نائبین دانیال سُلطانؒ کبیت ماہوماؒ اور حاجی مراد بھی اس موقع پر موجود تھے۔ روسیوں کی نصف کے قریب تعداد ہلاک یا زخمی ہوئی اور ان کا بارود کا ذخیرہ بھی تباہ ہو گیا۔ قلعے کی دیواروں میں شگاف پڑ گئے تھے۔ پانی بہت کم رہ گیا تھا اور کھانا پکانا ناممکن ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود یہ بہادر سپاہی آخر دم تک ڈٹے رہے۔ جب انھیں یقین ہو گیا کہ اب قلعہ کسی طرح نہیں بچ سکتا تو انھوں نے دشمن کا قیدی بننے کی بجائے اپنے آپ کو تباہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اتفاق سے عین اسی موقع پر انھیں پہاڑوں پر روسی فوج نظر آئی۔ آرگوٹنکی نے جو اس فوج کا کمانڈر تھا ایک بہت بڑا چکر لگا کر بالآخر آختی کے قلعے کے محصُورین کو بچا لیا۔

## ورونٹسوف کی انتظامی اصلاحات:

۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۶ء تک مشرقی قفقاز میں روسی اور امام شاملؒ کے مریدین دونوں دفاعی

---

❶ آختی کا مطلب روسی زبان میں ہے "اوہ تم" اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ نکولائی پریڈ کا معائنہ کر رہا تھا کہ اسے ایک سپاہی کے سینے پر سینٹ جارج کی سنہری صلیب نظر آئی۔ شہنشاہ رک گیا اور پوچھا کہ یہ تمغہ اس نے کس معرکے میں حاصل کیا ہے؟ سپاہی نے جواب دیا کہ آخ دی (اوہ آپ) شہنشاہ نہ سمجھ سکا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس بہادر سپاہی کو معرکہ آختی میں یہ تمغہ دیا گیا تھا۔ چونکہ آختی کا مطلب ''اوہ تم'' ہے اور وہ شہنشاہ سے خطاب کر رہا تھا اس لیے اس نے آختی کو آخ دی بنا دیا۔

پوزیشنوں پر اپنی جگہ ٹھہرے رہے۔ بہت کم ایسا ہوا کہ کوئی جھڑپ سنگین صورت اختیار کر گئی ہو۔ کسی کو بھی کوئی نقصان نہیں ہوا۔ مغربی داغستان بشمول آویریا اور چیچنیا کا خاصہ بڑا حصہ امام شامل ؒ ہی کے زیر اثر تھا۔ لیکن دوسری طرف رُوسیوں نے جا بجا قلعے تعمیر کر کے اور چھاؤنیاں بنا کر اپنی سرحدات کو بڑی حد تک مضبوط اور محفوظ بنالیا تھا۔ اس اثنا میں ورونٹسوف نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ فوجی اقدامات کا خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ وہ موافق حالات پیدا ہونے کا منتظر تھا اور دوسری طرف اس نے سِول انتظامات کی طرف اپنی پوری توجّہ مرکوز کر دی تھی۔ ورونٹسوف نے یہ انتظامات خاصی خوش اسلوبی سے کیے اور اس کی شہرت کا اصل راز ان انتظامی اصلاحات ہی میں ہے۔ دوسری طرف دفاع کے انتظامات کے ساتھ ساتھ اس نے چھاپہ مار کارروائیاں بھی جاری رکھیں۔

حاجی مراد کے کارنامے:

دوسری طرف امامؒ بھی اپنے فرض سے غافل نہیں تھے۔ قبائل پر ان کا اقتدار ۱۸۴۹ء میں پورے عُروج پر تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں مریدین ان کے ادنیٰ اشارے پر جان قربان کر دینے کے لیے تیار تھے۔ ان کے نائبین، جن میں حاجی مراد کی شخصیت سب سے زیادہ ممتاز تھی، مریدین کو مشکل سے مشکل مہم پر لے جانے کے لیے ہر وقت تیار تھے۔ رُوسیوں نے اگرچہ سالتی اور غرغیبل کو خاصی جانی قربانیوں کے بعد فتح کر لیا تھا لیکن ارگونکی توخ کے مقام پر ان کی شکست نے معاملہ برابر کر دیا تھا۔ توخ کے مقام پر کبیت ماہوماؒ کے قلعہ پر جنرل تو ولین نے ۲۲ہزار گولے برسائے روسی کمانڈر اس پر حملہ کرنے سے گریز کرتا رہا اور جنگ کے خاتمے تک توخ ناقابلِ تسخیر رہا۔ اسی سال حاجی مراد نے رُوسی داغستان کے مرکز اور سب سے بڑی فوجی چھاؤنی شورا پر کامیاب دھاوا بولا تھا جس پر شہنشاہ کو خود رُوسی کمانڈروں کو تنبیہ کرنا پڑی تھی۔ اس موقع پر حاجی مرادؒ نے گھوڑوں کے اُلٹے سم لگا کر تعاقب کرنے والوں کو شک وشبہ میں ڈال دیا تھا۔ اگلے سال حاجی مرادؒ نے مشرقی جارجیا پر حملہ کیا اور وہاں روسی چھاؤنی میں موجود تمام سپاہیوں کو تہ وتیغ کر دیا۔

## حاجی مرادؒ کے نام کی دہشت:

۱۸۵۱ء میں امام شاملؒ نے حاجی مرادؒ کو کیتا گو اور تبا سران کے صوبوں میں بھیجا تا کہ وہاں کے باشندوں کو رُوسیوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کریں۔ ایک بار پھر وہ معجزانہ طریقے سے بچ نکلے۔ ۵۰۰ افراد کے ہمراہ وہ دربند شورا سڑک پر واقع بوناخ کے گاؤں پر حملہ آور ہوئے اور وہاں روسیوں کے حلیف شاخ ولی کو ہلاک کر کے اس کے بیوی بچوں کو یرغمال کے طور پر لے آئے۔ بعد میں امام شاملؒ نے بھاری فدیہ لے کر ان کو رہا کیا۔ اس موقع پر حاجی مرادؒ کا تعاقب شروع ہو گیا تھا۔ لیکن وہ ۱۰۰ میل کا سفر تیں گھنٹوں میں طے کر کے اپنے علاقے میں خیر و عافیت سے پہنچ گئے۔ وہ حد درجہ بہادر تھے اور ان کا نام ان تمام علاقوں میں جہاں مقامی افراد نے روسیوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیے تھے، دہشت پھیلا دینے کے لیے کافی تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ ایک بار ۱۵۰۰ افراد پر مشتمل ملیشیا کے افراد جن کی کمان ایک روسی افسر کر رہا تھا، ۱۰ یا ۲۵ مریدین کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔ ان مریدین نے حاجی مرادؒ، حاجی مرادؒ! کے نعرے لگاتے ہوئے حملہ کیا تھا اور رُوسی سپاہی دہشت کے مارے بھاگ گئے تھے۔

## ایک غلط فہمی:

بدقسمتی سے حاجی مراد کچھ چال بازوں کے دھوکے میں آ گئے جنھوں نے ایک طرف سے امام شاملؒ اور دُوسری طرف سے حاجی مراد کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا تھا۔ حاجی مراد کو یہ باور کرایا گیا کہ امام شاملؒ ان کی شُہرت سے خائف ہو کر انھیں قتل کروانا چاہتے ہیں۔ یہ امامؒ کی ذات پر بہت بڑا بُہتان تھا۔ حاجی مراد جھانسے میں آ گئے اور انھوں نے اپنے آپ کو رُوسیوں کے حوالے کر دیا۔ پرنس ورونٹسوف نے انھیں ان کے باپ کے پاس طفلس بھیج دیا جو وہاں وائسرائے تھا۔ ساتھ ہی شہنشاہ سے اس بات کی اجازت لے لی کہ حاجی مراد قفقاز ہی رہیں تا کہ وہ اہم خدمات بجا لا سکیں۔ نکولائی نے لکھا: ''خدا کا شکر ہے۔ یہ اچھا آغاز ثابت ہوا ہے۔'' لیکن ساتھ ہی اس نے اس شُبہ کا اظہار کیا کہ وہ شخص جو ایک بار ہم سے غداری کر چکا ہے۔ کہیں دوبارہ ایسی ہی حرکت نہ کرے۔ بہر حال اس نے اس کام کی تمام تر

ذمہ داری ورونٹسوف پر ڈال دی۔ حاجی مراد کو بڑے عزت و احترام سے رکھا گیا لیکن ان کا تمام خاندان امام شامل کے زیر اثر سلمس کے علاقے میں تھا اور وہ ان کے غم میں اس حد تک پریشان رہے کہ بیمار ہو گئے۔ انھیں گروزنی بھجوایا گیا تا کہ وہ وہاں سے کسی طرح اپنے خاندان کو رہا کروا سکیں لیکن انھیں ناکامی اٹھانی پڑی اور وہ ایک بار پھر طفلس آ گئے۔

اب حاجی مراد نے نوخا جانے کی اجازت مانگی تا کہ وہ وہاں دینی فرائض بہتر طور پر ادا کر سکیں۔ انھیں اپنی غلطیوں پر پشیمانی ہو رہی تھی۔ وہ غیور کے پنجوں میں تھے اور آزادی جیسی نعمت سے محروم تھے۔ ہر وقت ان کی نگرانی کی جاتی تھی اور پھر انھیں اپنے بیوی اور بچوں کا خیال پریشان کر رہا تھا۔ امام شامل اور ان کے دیگر کوہستانی ساتھیوں کی طرح حاجی مراد بھی انتہا درجے کے شفیق باپ اور محبت کرنے والے شوہر تھے۔ ایک بار پھر انھوں نے فرار ہونے کا فیصلہ کیا۔ ایک شام جب وہ اپنے چار قریبی ساتھیوں کے ہمراہ گھوڑے پر سیر کرنے کے لیے نکلے اور ان کے ساتھ کمانڈر انچیف کے باڈی گارڈ کے صرف پانچ یا چھ کاسک سوار تھے، انھوں نے یکا یک پستول نکالا اور دستے کے کمانڈر کو ختم کر دیا۔ ان کے ساتھیوں نے ایک اور کاسک کو مار ڈالا وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گھوڑے سرپٹ دوڑاتے ہوئے بچ نکلے۔ کیپٹن بوجکیف، جو حاجی مراد کی نگرانی پر مامور تھا، اس واقعے پر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے! وہ فوراً طفلس کی طرف چل پڑا۔ اس کا استقبال جیسا کچھ ورونٹسوف نے کیا ہو گا، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اب ورونٹسوف کو یہ خوشگوار اطلاع نکولائی کو دینا تھی۔ اس نے حاجی مراد کے بارے میں ذاتی ذمہ داری لے رکھی تھی اور اب اس کے ایک جونیئر افسر کی لاپروائی کی وجہ سے اسے جواب دہ ہونا پڑ رہا تھا۔ مزید برآں حاجی مراد کے بچ نکلنے کی وجہ سے نئے خطرات پیدا ہو سکتے تھے۔

حاجی مراد کی شہادت:

یہ روسیوں کی خوش قسمتی تھی کہ نوخا کا کمانڈنٹ کرنل گورگانوف خاص ہوشیار اور بیدار مغز شخص تھا۔ اس نے اسی وقت ملیشیا کو حکم دے دیا کہ حاجی مراد کا تعاقب کیا جائے۔ تعاقب کا

نتیجہ بے حاصل نہ رہا۔ دو روز بعد حاجی مراد کا سُراغ لگا لیا گیا اور ملیشیا کے ایک بڑے گروہ نے ان کو گھیرے میں لے لیا۔ یہ دیکھ کر کہ اب بچ نکلنا مشکل ہے۔ مریدین نے خنجروں سے گڑھا کھودا اور اپنے گھوڑوں کو ذبح کر کے ان کے ڈھیر کے پیچھے مورچہ بنا لیا۔ جب تک ان کی گولیاں باقی تھیں وہ دشمن کو روکنے میں کامیاب رہے۔ گولیاں ختم ہو گئیں تو حاجی مرادؒ ننگے سر ہاتھ میں تلوار لیے دشمن پر ٹُوٹ پڑے۔ لیکن دشمن تعداد میں بہت زیادہ تھا۔ بالآخر وہ لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ ان کے دوسرے دو ساتھی شدید زخمی حالت میں قیدی بنا لیے گئے۔ اس طرح ۲۴ اپریل ۱۸۵۲ء کو وہ بہادر شخص اللہ سے جا ملا جس کے بارے میں یہ بات بلا مُبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ وہ ایک دلیر قوم کا دلیر ترین سپوت تھا۔ وہ خطروں سے تمام عُمر کھیلتا رہا اور اس نے رُوس کی غلامی میں آرام دِہ زندگی کی نسبت جنگلوں اور پہاڑوں کی پُر خطر لیکن آزاد زندگی کو ترجیح دیتے ہوئے جان جانِ آفریں کے سُپرد کر دی۔

حاجی مرادؒ کی صلاحیتیں:

جنرل اوکوپچی نے حاجی مرادؒ کے بارے میں لکھا ہے:

''وہ شامل کی مانند بہت بڑی فوجی مُہمات کی رہنمائی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ لیکن چھاپہ مار گروہوں کی قیادت اور گوریلا کارروائیوں کے لیڈر کی حیثیت سے ان کا جواب نہیں۔ ان کے لیے یہ معمولی بات تھی کہ ۴۰۰ یا ۵۰۰ سواروں کی قیادت کرتے ہوئے اچانک ہماری فوجوں کے عقب میں نمودار ہو جائیں یا ہماری سرحدوں کے اندر بہت دُور تک پہنچ جائیں یا آج پچاس میل اور کل ساٹھ میل کا سفر طے کریں ہمیں غلط قسم کے خطرات بھانپنے پر مجبور کریں اور اس طرح بھگدڑ مچا کر صاف بچ نکلیں۔''

بیریاٹنکی:

۱۸۵۲ء میں پرنس بیریاٹنکی بائیں بازو کا چیف مُقرر ہُوا اس کے زیرِ کمان ۱۰ ہزار سپاہیوں کا لشکر تھا۔ بیریاٹنکی نے بعد میں خاصی کامیابیاں حاصل کیں۔ اس کی ابتدائی تعلیم نے اس کی

صلاحیتیں اُبھارنے میں نمایاں کردار انجام دیا تھا۔ اس کی حیرت انگیز کامیابیوں کی وجہ سے مناسب ہوگا اگر ہم اس کی ابتدائی تعلیم کا جائزہ لیں۔

بیر یاٹنکی کے والد نے اس کے لیے جو تعلیمی نصاب مرتب کیا تھا اور اسے جس قسم کی تعلیم سے آراستہ کیا، اس کا جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ پانچ سال کی عمر تک وہ گھر ہی میں رہا۔ آئندہ دو سال میں اس کے جسم کو مشقتوں کا عادی بنایا گیا۔ جسمانی ورزشیں، نیزہ بازی، گھڑ سواری، ٹھنڈے پانی کے غسل اور اسی طرح کی دوسری کئی چیزوں کی مدد سے جسم کو خاصا مضبوط بنایا گیا۔ پھر سات سال کی عمر میں اسے زبانیں سیکھنے پر لگایا گیا۔ اس زمانے میں رُوس کے اُونچے خاندانوں میں رُوسی زبان پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا تھا۔ لیکن بیر یاٹنکی کو روسی زبان کے علاوہ فرانسیسی، جرمن، اطالوی اور انگلش سکھائی گئی۔ یہی نہیں اس کے بعد اسے لاطینی، یُونانی اور عربی کی تعلیم بھی دی گئی۔ شاعری، خطابت، حساب، انجینئرنگ، عملی زراعت اور لکڑی کے کام میں بھی وہ ماہر تھا۔ موخر الذکر علوم بیر یاٹنکی میں عملی صلاحیتیں پیدا کرنے کے لیے سکھائے گئے تھے۔ کچھ سال ان علوم کے مطالعے میں گزارنے کے بعد بیر یاٹنکی پانچ سال کی سیاحت کے لیے روس سے روانہ ہوگیا۔ یہ سیاحت یورپ کے تمام تر ملکوں پر محیط تھی اور مقصد یہ تھا کہ اس سفر سے اس میں بالغ نظری اور وسعت خیال پیدا ہو اور زندگی کے عملی مسائل کو سمجھنے کا شعور پیدا ہو سکے۔ اس سفر میں اس کے ساتھ اساتذہ کا ایک دستہ بھی تھا۔ ایک ڈاکٹر، ایک کیمیا دان، ایک ماہر نباتیات، ایک مکینک ان کے علاوہ تھے۔

یورپ کی پانچ سالہ سیاحت کے بعد یہ سب لوگ روس کے دو سالہ سفر پر بھی اس کے ہمراہ رہے۔ اس تمام مرحلے کے ختم ہونے پر اسے اپنی آبائی جاگیر میں کھیتی باڑی کی نگرانی کرنا تھی۔ اس کے باپ کی وصیت تھی کہ وہ چاہے تو بعد میں وزارتِ داخلہ یا وزارتِ خزانہ میں ملازمت اختیار کر لے۔ لیکن اسے کسی حال میں بھی فوج، سفارت یا بادشاہ کے درباری کا کام نہیں کرنا چاہیے۔ باپ نے اس وصیت کے ساتھ ہی اپنی تمام دولت اور جاگیریں بیٹے کے نام کر دی تھیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ بیر یاٹنکی نے اس وصیت کو نظر انداز کرتے ہوئے فوج

میں شامل ہونے کی ٹھان لی۔ شاہی خاندان سے قریبی تعلقات کی وجہ سے یہ بات ملکہ تک پہنچی تو اس نے بیریاٹنکی کے خیالات کی حمایت کرتے ہوئے اسے اپنی رجمنٹ میں لے لیا۔

بیریاٹنکی فطری طور پر مُہم جُو شخص تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے قفقاز جانے کی ٹھان لی۔ اسے ولمینوف کی زیرنگرانی بحیرۂ اسود کی کاسک رجمنٹ میں متعین کر دیا گیا۔ یہاں اُس نے ذاتی شجاعت کے جوہر دکھائے۔ ایک معرکے میں وہ واحد شخص تھا جو زندہ بچا اور شدید زخمی ہونے کے باوجود اکیلا لڑتا رہا۔ اس کی بہادری کے انعام میں زار نے اسے سُنہری تلوار دی۔ آئندہ پندرہ سال کے عرصے میں وہ مسلسل مصروف پیکار رہا اور متعدد بار زخمی ہو کر پیٹرز برگ آیا لیکن صحت یاب ہو کر دوبارہ میدانِ جنگ میں پہنچ گیا۔ مشہور روسی ادیب ٹالسٹائی لکھتا ہے:

> ''کمانڈر، افسر اور جوان سب اس سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ وہ یقیناً ایک بے مثل سپہ سالار ہے۔''

بیریاٹنکی کی ابتدائی تعلیم نے اس میں گہری نظر پیدا کر دی تھی۔ وہ صورتحال کا جائزہ لینے میں خاصی مہارت رکھتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس مہم میں جو گزشتہ پچیس سال سے ناکام ہوتی چلی آ رہی تھی، اس نے کامیابی حاصل کی۔

۹ سال بعد بیریاٹنکی کا تقرر قفقاز میں بحیثیت وائسرائے اور کمانڈر انچیف کے ہُوا۔ اس نے گزشتہ تجربات سے خاصا فائدہ اُٹھایا۔ فرئیگ نے خاصے بڑے پیمانے پر جنگل کاٹنے کا کام ۱۸۴۶ء ہی سے شروع کر رکھا تھا۔ اس کے بعد وڈوکیموف نے بھی اس کام کو جاری رکھا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ رُوسیوں کے رسل و وسائل کے راستے محفوظ ہو گئے اور ساتھ ہی مجاہدین کے ان علاقوں تک رسائی حاصل ہو گئی جہاں پہنچنا ممکن نہ تھا۔

امامؒ کی مشکلات:

چیچنیا کے عوام کے لیے سرحدوں کے قریب رہنے کی وجہ سے زندگی خاصی تلخ ہو چکی تھی۔ رُوسیوں کی ہر فتح ان کے لیے مصائب کا سامان بن جاتی تھی۔ رُوسی انھیں طرح طرح سے

پریشان کرتے اور تحریک مریدیت کا ساتھ دینے کی وجہ سے انھیں ظلم وستم کا نشانہ بناتے۔ امامؒ انھیں اس صورت حال سے بچانے کے لیے بیوی بچوں، ساز وسامان اور مویشی سمیت چیچنیا کے اندرونی علاقوں میں پناہ دے دیا کرتے تھے۔ ہوتے ہوتے چیچنیا کا یہ علاقہ جو سرحدوں پر واقع تھا، ویران ہوتا چلا گیا۔ یہ علاقہ خاصا زرخیز تھا اور نہ صرف چیچنیا کے بنجر علاقوں بلکہ داغستان کے لیے بھی غلے کی منڈی کی حیثیت رکھتا تھا۔ امامؒ کا اثر ورسُوخ جن علاقوں میں تھا وہ زیادہ تر بنجر تھے اور دُوسری طرف یہ زرخیز علاقہ جو سرحدات پر واقع تھا امامؒ کے حامیوں سے خالی ہونے کی وجہ سے رُوسیوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ روسیوں نے اپنی کاسک لائن کو مزید آگے بڑھالیا تھا اور اس طرح ان کا دائرہ اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔

ان علاقوں میں زمین کی محبت خاصی گہری تھی اور برادری اور قبیلے کے رشتے بھی بہت مضبوط تھے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اس ہجرت کی وجہ سے امامؒ کے کئی مریدین اور نائبین تک ان سے الگ ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ صدیوں تک جاہلیت میں مُبتلا عوام اس قدر جلد امامؒ کی دعوت کو دلوں کی گہرائیوں سے قبول کرنے کے قابل نہ تھے۔ وہ ذرا سی آزمائش سے گھبرا جایا کرتے تھے اور ساتھ چھوڑنے پر تُل جاتے تھے۔ ایک طرف یہ صُورت حال تھی تو دوسری طرف کاسک فوجی نو آبادیاں مزید مضبوط ہو چکی تھیں بلکہ کُچھ اور آگے بڑھ آئی تھیں۔ پھر درخت گرانے کا کام بڑی حد تک ہو چکا تھا۔ وہی درخت جن کے تحفظ کے لیے امامؒ نے سخت قوانین بنائے تھے، اب رُوسی کُلہاڑیوں کی مدد سے گرائے جا رہے تھے۔ یہ درخت دفاعی حصار تھے اور ان کا گرایا جانا حقیقت میں دفاعی مورچوں کی بربادی تھی۔ یہی نہیں رُوسیوں نے اس دوران میں دفاعی اہمیت کی سڑکوں کی تعمیر کا کام بھی کافی حد تک مکمل کر لیا تھا۔

لیوٹالسٹائی:

مشہور روسی مُصنف کاؤنٹ لیوٹالسٹائی اس وقت بیسویں توپ خانہ بریگیڈ یر میں افسر تھا اور اسی قیام کے دوران، اس نے قفقاز (کاکیشیا) اور کاسک روسی چھاؤنیوں کے بارے میں اپنے تجربات کو خوب صورت کہانیوں میں سمویا۔ ''دی کاسکز'' (The Caucasus)

۱۸۵۲ء کے واقعات پر مبنی ایک کہانی ہے جس میں اس نے چیچنیا کے بالمقابل روسی افواج کی زندگی کو بڑے جاندار انداز میں پیش کیا ہے۔ٹالسٹائی کریمیا کی جنگ کے شروع میں ہی سیوسٹاپول منتقل کر دیا گیا تھا۔اس نے حاجی مرادؒ کی زندگی پر مبنی ایک ناول [1] بھی لکھا تھا۔

## کریمیا کی جنگ:

ترکی نے ۱۵ اکتوبر ۱۸۵۳ء کو روس کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیا تھا اور فرانس اور انگلینڈ بھی ۲۸ مارچ ۱۸۵۴ء کو اس جنگ میں کود پڑتے تھے۔ یہ جنگ ۳۰ مارچ ۱۸۵۶ء کو ختم ہوئی تھی۔ اس جنگ کے دوران اگر قفقاز کے مجاہد بھرپور جدوجہد کر کے رُوسیوں پر کاری ضرب لگانے کی کوشش کرتے تو غالب گمان ہے کہ وہ مکمل کامیاب ہو جاتے۔لیکن بدقسمتی سے مجاہدین اور اتحادیوں میں سے کسی نے بھی اس موقع سے پورا پُورا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ اگر اس موقع سے فائدہ اٹھایا جاتا تو روسی اپنی تمام تر قُوت کے باوجود اس صورت حال کا قطعی مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔اس موقع پر اگر ایران جنگ میں کُود پڑتا تو رُوسیوں کی کامیابی کی شاید ہی کوئی صُورت نکل سکتی۔ حالات اس قدر بگڑ چکے تھے کہ ورونٹسوف نے اپریل ۱۸۵۴ء میں یہ لکھا بھی کہ ایران کے رویے کے پیش نظر داغستان سے تمام روسی چھاؤنیاں ہٹالی جائیں۔اس طرح سولک سے لے کر آراس تک تمام مشرقی قفقاز امامؒ کے ہاتھوں میں آ سکتا تھا۔لیکن نکولائی اوّل نے اس تجویز کو مکمل طور پر رد کر دیا اور کہا کہ ایرانیوں کے مقابلے کے باوجود صورتحال اتنی نازک نہیں۔

شاہِ ایران کے رویے پر زار کو خاصی تشویش تھی اور اگرچہ زار نے ورونٹسوف کی تجویز مسترد کر دی تھی، پھر بھی وہ اس سرحد کی سلامتی کے بارے میں خاصا مُتفکر تھا۔خوش قسمتی سے وہ ایران کے ساتھ ایک خُفیہ مُعاہدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔اس خفیہ معاہدے کی رُو سے روس ایران کا سابق تاوان جنگ معاف کرنے پر تیار ہو گیا تھا۔ دوسری طرف ایران نے غیر جانب دار رہنے کا عہد کر لیا۔ یہ معاہدہ ۲۹ ستمبر ۱۸۵۴ء کو طے پایا اور اس طرح روس کی سرحد پر

---

[1] اسے فلمایا بھی جا چکا ہے اور ستار طاہر نے اس کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔

منڈلاتے ہوئے خطرات خاصی حد تک ختم ہو گئے۔

رُوسی یرغمال:

امامؒ نے اس دوران اپنی تحریک کو مزید مستحکم بنایا انھوں نے اگست ۱۸۵۳ء میں ۵ ہزار افراد کے ہمراہ جارجیا کے مشرق میں جارو بلکیانی کے علاقوں پر چڑھائی کر دی لیکن اس موقع پر روسی کمانڈر کی پھرتی اور جنگی مہارت آڑے آئی۔ روسی کمانڈر آختی سے پانچ برف پوش چوٹیوں کو یکے بعد دیگرے عبور کرتا ہُوا پہنچا اور اس تاریخی مارچ کے بعد امامؒ کی فوجوں کا سامنا کیا جس میں امامؒ کو پسپا ہونا پڑا۔ مجاہدین کی ایک دوسری کوشش بھی ناکام رہی جب پرنس تاتا داز کی قیادت میں روسی افواج کے مقابلے میں ان کے ۵۰۰ افراد شہید ہو گئے۔ اس سے اگلی صبح مجاہدین نے امام شاملؒ کے بیٹے قاضی محمدؒ کی قیادت میں چھاپا مارا اور سینز دال میں جو پرنس اور لیانی کی رہائش گاہ تھی، اس کی بیوی، سالی، لڑکی، بچوں اور کچھ دوسرے افراد کو پکڑ کر لے گئے۔ یہ رُوسی قیدی بعد میں یرغمال کے طور پر کام آئے۔

امامؒ اپنے بیٹے جمال الدین کو ابھی تک نہیں بھُولے تھے۔ جمال الدین ۱۸۳۹ء میں اخالگو کے محاصرے کے موقع پر یرغمال کے طور پر روسیوں کے پاس بھجوا دیا گیا تھا۔ شرط یہ تھی کہ جمال الدین کو مقامی نمبردار ہی کی تحویل میں رہنے دیا جائے لیکن روسیوں نے انتہا درجے کی عہد شکنی کا ثبوت دیا۔ انھوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جمال الدین کو ماسکو اور وہاں سے پیٹرز برگ پہنچا دیا۔ وہ گزشتہ کئی برسوں سے روسیوں ہی کے پاس تھا۔ زار کا مقصد یہ تھا کہ جمال الدین کی تعلیم و تربیت کے بعد اسے قفقاز کے مفتوح ہونے پر وہاں کا وائسرائے مقرر کر دیا جائے۔ اسی مقصد کے تحت زار جمال الدین کو واپس کرنے میں لیت ولعل سے کام لے رہا تھا۔ یہ انتہا درجے کا ظالمانہ فعل تھا اور امامؒ نے اس کا بدلہ لینے کی ٹھان رکھی تھی۔ ان کا یہ خیال بجا تھا کہ اگر رُوسیوں کے کسی مُعزز خانوادے کے افراد ہاتھ لگ گئے تو ان کے بدلے میں ان کے بیٹے کی واپسی ہو جائے گی اور ان کا یہ خیال غلط بھی نہ تھا۔ یہ خواتین جنھیں امامؒ نے بڑی عزّت و احترام سے رکھا تھا، جارجیا کے آخری زار جارج دوازدہم کی

پوتیاں تھیں۔

## جمال الدین کی واپسی:

زار نے ان خواتین کی بازیابی کے لیے کوشش شروع کر دیں اور ان کے بدلے میں امام شاملؒ کے بیٹے جمال الدین کو رہا کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اب مشکل یہ درپیش تھی کہ امامؒ نے اپنے بیٹے کی رہائی کے ساتھ ساتھ ایک لاکھ روبل کا مطالبہ بھی پیش کر دیا۔ خاصی ردوقدح کے بعد ۴۰ ہزار روبل اور جمال الدین کی رہائی کے بدلے ان خواتین اور بچوں کا تبادلہ طے پایا اور ۱۰ مارچ ۱۸۵۵ء کو مچک دریا کے کنارے ایک سادہ سی تقریب میں یہ تبادلہ عمل میں آیا۔

جمال الدین جو کہ روسی رسالے میں لیفٹیننٹ کے عُہدے پر فائز تھے، جارجیا کی شہزادی کے خاوند تاتاواز اور بیرون نکولائی کے ہمراہ آئے۔ ان کے ساتھ ۳۰ کی تعداد میں حفاظتی دستہ اور ایک چھکڑا تھا جس پر ۴۰ ہزار روبل لائے گئے تھے۔ جمال الدین دو روسی افسروں اور رقم کے ہمراہ دریا کے اس پار آئے اور وہاں سے جارجیا کی شہزادیاں اور دُوسرے افراد دوسرے کنارے پر پہنچا دیے گئے۔

جمال الدین کی روسی وردی اُتروا کر اسے مقامی لباس پہنا دیا گیا اور پھر وہ سوار ہو کر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے جہاں امام شاملؒ، قاضی محمدؒ اور دانیال سلطان کے ہمراہ اپنے مریدین کے حلقے میں گھرے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ عجیب منظر تھا۔ مدّتوں کے بچھڑے باپ بیٹے کی ملاقات ہو رہی تھی۔ جب جمال نزدیک آئے تو امامؒ نے اشک آلود آنکھوں سے اپنے بیٹے کو گلے لگایا لیکن بیٹا اتنی لمبی جُدائی کے بعد اجنبی بن چکا تھا۔ یہ اندوہناک حقیقت تعجّب خیز نہ تھی جمال الدین بارہ سال کی عمر سے لے کر اب تک سینٹ پیٹرز برگ میں رہا تھا اور روسی فوج میں لیفٹیننٹ تھا۔ اس لیے اس کا باپ بچپن کے ساتھی، وہ بلند و بالا پہاڑ جن میں اس نے آنکھ کھولی تھی اس کے لیے اجنبی بن چکے تھے۔ وہ اب اپنے قبیلے کے لوگوں میں زندگی گزارنے کے قابل نہ رہا تھا۔

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

اس کی حیثیت ایک فریب خوردہ شاہین کی سی تھی۔ اسے اپنے لوگوں سے کسی قسم کی دلچسپی یا ہمدردی نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ عرصے بعد مریدین کے دل میں مختلف شکوک پیدا ہونے لگے۔ اسی اثناء میں جمال نے جو رُوس کی عظیم طاقت سے خاصا مرعوب ہو چکا تھا، امامؒ کو ہتھیار ڈال دینے تک کا مشورہ دیا۔ امامؒ نے اسے اس کے چھوٹے بھائی قاضی محمدؒ کے گاؤں میں بھجوا دیا کہ شاید بھائی کی محبت اس کے دل میں گھر کر سکے۔ انھوں نے یہ بھی کوشش کی کہ وہ اس گاؤں میں شادی کر لے لیکن تمام ترغیبات بے سُود ثابت ہوئیں۔ جمال کے لیے کوئی چیز بھی دل لُبھانے کا سامان نہ بن سکی۔ سینٹ پیٹرز برگ کے بڑے بڑے محلوں اور فوجی افسروں کے کرّ وفر سے رہنے والا جمال کھُلے پہاڑوں اور دیہات کی سادہ زندگی پسند نہ کر سکا۔ وہ اپنے آپ کو ان حالات میں ڈھال نہ سکا اور غمگین اور اُداس رہنے لگا۔ یہی صُورت حال اسے لے ڈوبی۔ تین سال کے اندر اندر امامؒ کا یہ فرزند جسے رُوسیوں نے امامؒ کے لیے اجنبی بنا دیا تھا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دُنیا سے رُخصت ہو گیا۔

امامؒ کے معمولات:

امامؒ کی رہائش گاہ، جہاں جارجیا کی شہزادیاں مقیم رہیں، آج بھی کھنڈرات کی صُورت میں خولخولونڈی کے دائیں کنارے پر دیکھی جا سکتی ہے۔ ان دنوں یہ ایک اچھی خاصی رہائش گاہ تھی۔ اس میں کئی مکانات تھے اور ان کے گرداگرد ایک خندق تھی۔ یہاں ان کی ہر بیوی کے پاس تین کمروں کا مکان تھا۔ امامؒ اسلامی اصولوں کے مُطابق ہر بیوی کے پاس ایک ایک ہفتہ رہتے تھے۔ ان ازواج کا باقی وقت بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش میں گُزرتا تھا۔ امامؒ کے اپنے کمرے میں صرف ان کے بیٹے، ان کا خزانچی حاجو، سیکرٹری امیر خان اور کچھ بہت قریبی ساتھی آ سکتے تھے۔ باقی ملاقاتی مہمانوں کے کمرے میں ہی بٹھائے جاتے تھے اور امامؒ ان سے وہیں ملتے تھے۔

امامؒ کے قریبی ساتھیوں میں سے دانیال سُلطان خاصے اہم تھے۔ ان کی بیٹی امامؒ کے بیٹے قاضی محمدؒ سے بیاہی گئی تھی۔ یُوں تو اور بھی لوگ امامؒ کے مہمان بن کران کے دسترخوان پر مدعو ہوتے لیکن ان کا مستقل مہمان ایک ہی تھا۔ یہ ہمیشہ ان کے دسترخوان پر موجود ہوتا اور اس کے بغیر امامؒ کبھی کھانا نہ کھاتے تھے۔ یہ مہمان ان کی ایک پالتو بلی تھی۔ چتکبرے رنگ کی یہ بلی جو انھیں ایک بھگوڑے رُوسی نے تحفے میں دی تھی، ہمیشہ ان کے ساتھ رہی۔ امامؒ کو اس بلی سے بے حد محبت تھی۔ وہ جب تک بلی کو ساتھ نہ بٹھا لیتے کھانا نہ کھاتے۔ محاصرے کے دوران جب امامؒ جنگل میں تھے تو یہ بلی اُداس ہوگئی اور قاضی محمدؒ کی تمام تر نگہداشت اور محبت کے باوجود امامؒ کی جُدائی کا صدمہ برداشت نہ کرسکی اور مرگئی۔ قاضی محمدؒ نے اسے بڑے عزت و احترام سے دفن کیا۔ امامؒ کو بلی کے مرنے کا پتہ چلا تو انھیں بے حد صدمہ ہوا۔ وہ کہتے تھے کہ اب شاید میرا انجام بھی زیادہ دُور نہیں۔ ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ امامؒ کا دل محبت سے کس درجہ بھرپور تھا۔ وہ جہاں میدان جنگ میں بلا کے دلیر اور کُفار کے لیے انتہائی سخت بدلہ لینے والے تھے، وہاں اپنی گھریلو زندگی میں بحیثیت باپ، بحیثیت خاوند اور سب سے بڑھ کر بحیثیت انسان انتہائی شفیق تھے۔

امامؒ کا حُسنِ سُلوک:

امام شاملؒ کے گھریلو نوکروں میں مسلمان اور عیسائی دونوں تھے۔ مؤخر الذکر جنگی قیدی تھے اور امامؒ نے عیسائیوں کو ازخود آزادی دے دی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ امامؒ کے اعلیٰ اخلاق کی وجہ سے ان کی خدمت میں بدستور مصروف رہے۔ امامؒ کے دوست جمال الدین کے بیٹے عبدالرحمٰن نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

> ''وہ عام آدمیوں پر بے حد مہربان تھے۔ نوکروں، فقیروں اور حتیٰ کہ قیدیوں تک کے معاملے میں انتہائی نرم دل واقع ہوئے تھے۔ ان کا یہ ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ غریبوں کے دل سے نزدیک ہے اور غریبوں کی دُعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں۔ جب بھی وہ کسی مہم پر نکلتے، غریبوں کو اکٹھا کر کے انھیں کپڑے دیتے، ان کی

رُوپے پیسے سے مدد کرتے اوران سے فتح کی دُعا کے لیے کہتے۔"

امام شاملؒ نے یکے بعد دیگرے چھ شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی فاطمہ ❶ عبدالعزیز کی بیٹی تھیں۔ یہ وہی خاتون تھیں جنھوں نے انتوکول کے مقام پر امامؒ کے شدید زخمی ہونے پر ان کا علاج کیا تھا۔

دوسری بیوی غمری کی رہنے والی تھیں اوران کا نام دادگود تھا۔ یہ اخالگو کے محاصرے میں اپنے شیر خوار بچے کے ساتھ شہید ہوگئی تھیں۔

زیدت قاضی قوموخ کے جمال الدین کی بیٹی تھیں۔ یہ وہی جمال ہیں جو امام کے استاد اوران کے عزیز ترین دوست بھی تھے۔ امینال چیچنیا کے پہاڑوں کی رہنے والی تھیں اور شونت وہ بیوی تھیں جو آخوردی ماہوماؒ کے ۱۸۴۰ء میں مزدک پر حملے کے دوران قید ہوئی تھیں اور امامؒ نے ان سے شادی کر لی تھی۔ امامؒ کا یوں تو سب بیویوں سے یکساں تعلق تھا لیکن شونت سے انھیں سب سے زیادہ محبت تھی۔ وہ مذہباً عیسائی تھیں لیکن بعد میں انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ باوجود اس بات کے کہ انھیں قیدی بنا لیا گیا تھا اوران کا مذہب بھی مختلف تھا، انھوں نے امامؒ کے ساتھ نہ صرف شادی کی بلکہ اسلام بھی قبول کیا۔ یہی نہیں شونت امامؒ کو جان و دل سے عزیز رکھتی تھیں۔ انھیں امامؒ سے اس درجہ محبت تھی کہ جب ان کے بھائی نے جو ایک امیر تاجر تھا، انھیں ۱۰ ہزار روبل کے بدلے حاصل کرنا چاہا تو امامؒ نے کہا کہ میں دس لاکھ روبل کے بدلے بھی شونت کو دینے کے لیے تیار نہیں اور نہ خود شونت کسی قیمت پر واپس جانا چاہتی ہے۔

شونت باقی بیویوں کے ساتھ اچھے سلوک سے رہیں اور کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔

جب امامؒ کو غونیب کے مقام پر گھیرے میں لے لیا گیا تھا اوران کے تمام خاندان کی تباہی مقدّر ہو چکی تھی تو شونت کو امام کا خیال لگا ہوا تھا۔ جب انھیں اس بات کی اجازت دی گئی کہ وہ قید کے ایام امامؒ کے ساتھ گزار سکتی ہیں تو انھوں نے اپنی زندگی ان کے ساتھ بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ چاہتیں تو اپنے آبائی گھر لوٹ سکتی تھیں لیکن انھوں نے امامؒ کی معیّت کو آزادی سے

❶ ان کے بطن سے امام کے تین بیٹے تھے۔ جمال الدین، قاضی محمد اور شفیع محمد۔

کہیں زیادہ قیمتی سمجھا اور زندگی کے باقی دن امامؒ کے ساتھ ہی گزارے۔

## امام شاملؒ کے بارے میں رُوسی نقطۂ نظر:

امامؒ کے بارے میں رُوسی سرکاری پالیسی دوبارہ تبدیل ہوئی۔ رسول غمزات نے (جو امام شاملؒ کی مادری زبان آور کا نامور شاعر ہے اور جس کے چالیس شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں) ایک دور میں امامؒ کے خلاف ایک نظم لکھی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب امامؒ روس کی حکومت کے معتُوب تھے۔ اب امامؒ کے بارے میں روس کی سرکاری پالیسی میں خاصا انقلاب رونما ہوا ہے اور انھیں ''برطانیہ اور ترکی کے ایجنٹ'' کی بجائے آجکل ان الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے:

''شامل (پیدائش ۱۷۹۹ء وفات ۱۸۷۱ء) نے مقامی جاگیرداروں اور روسی شہنشاہیت کی نو آبادیاتی پالیسی کے خلاف مریدیت کے جھنڈے تلے مسلح جدوجہد کی۔'' (میرا داغستان۔ رسول غمزات ص ۸۶۔ ماسکو ۱۹۷۰ء)

رسول حمزہ توف نے اپنی ایک نظم میں امامؒ کے خلاف لکھے گئے اشعار کے بارے میں یوں معذرت کی ہے:

اپنے ابتدائی دور میں مجھ سے ایک ایسی غلطی سرزد ہو چکی ہے جس پر آج تک میں شرمندگی محسوس کرتا ہوں۔

میرے دوستوں نے بار بار اور بڑی بیباکی کے ساتھ اس غلطی پر میری سرزنش کی ہے اور یوں مجھے سزا ملتی رہی۔ لیکن میرا ضمیر جس طرح مجھے سزا دیتا رہا ہے اس سے زیادہ سخت سزا کوئی دے ہی نہیں سکتا۔

ابا کہا کرتے تھے: ''اگر تم نے کوئی شرمناک حرکت ایسی کی ہے جو تمہارے شایان شان نہ تھی تو چاہے تم لاکھ دعائیں کرو وہ داغ تمہاری پیشانی سے مٹ نہیں سکتا۔''

ابا یہ بھی کہا کرتے تھے: ''اگر کسی آدمی نے شرمناک رویہ اختیار کیا ہو اور کئی سال بعد اس رویہ پر شرمندہ ہو تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پرانا قرض ان سکوں کے ذریعے ادا کرنا جو رائج نہ رہے ہوں۔''

اور ابا ہی کا یہ بھی کہنا تھا: ''اگر تم برے آدمی کو کھلی چھوٹ دے دیتے ہو اور اسے مکان سے باہر نکل جانے دیتے ہو تو پھر اس جگہ کو پیٹنے سے کیا فائدہ جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا؟''

''بیل چوری ہو چکے ہوں تو دروازے پر بھاری تالا لگانے کی کیا ضرورت ہے؟''

یہ ساری باتیں صحیح ہیں اور میں جانتا ہوں کہ جب تیر کمان سے نکل چکا ہو تو افسوس کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ مگر قارئین کبھی کبھی مجھے ایسے خطوط لکھتے ہیں، جن سے مجھے کچھ ایسی باتیں یاد آ جاتی ہیں کہ پرانے زخم پھر ہرے ہو جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ لوگ میری کھڑکی پر پتھر برسا رہے ہوں اور یہ کہہ رہے ہوں کہ ''رسول حمزہ توف باہر آؤ، ہمیں اپنا منہ دکھاؤ۔ ہم جو تمہاری تحریریں پڑھتے ہیں یہ بتاؤ کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟''

''میں تمہیں کیا بتاؤں۔''

''تمہیں یاد نہیں؟ ۱۹۵۱ء میں تم نے ایک نظم لکھی تھی جس میں شاہ میل پر کیچڑ اچھالا تھا لیکن ۱۹۶۱ء میں تم نے ان کی تعریف میں نظم لکھی۔ دونوں ہی نظموں پر رسول حمزہ توف کے دستخط تھے۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ دونوں رسول ایک ہی ذات کے نام تھے یا دونوں میں کوئی فرق تھا۔ اور ان دونوں میں سے کسی کی بات کا یقین کیا جائے؟

یہ اصل سوال ہے۔ تیر اگر جسم کے کسی دوسرے حصے میں پیوست ہو گیا ہو تو اسے باہر نکالا جا سکتا ہے، لیکن دل میں اتر جانے والے تیر کا کیا کیا جائے؟

عزیز قارئین! میں نہیں جانتا کہ آپ کی عمریں کیا ہیں؟ ہوسکتا ہے ابھی آپ نے شباب کی منزلوں میں قدم ہی رکھا ہو۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ کبھی آپ کو زندگی میں کچھ حدیں پار کرنی پڑی ہیں یا نہیں؟ میرے ساتھ ایسا ہو چکا ہے۔ میں نے محبت کی، اور میں خود کو بھی یہ بتانے سے قاصر تھا کہ میں کس چیز سے محبت کر رہا ہوں، اور بعد میں مجھے ندامت کا سامنا کرنا

پڑا۔

ایسا ہوتا ہے کہ دو پڑوسیوں کی کھڑکیوں کے درمیان ایک تنگ گلی سی ہے۔ دونوں ہی کھڑکیوں پر دو پڑوسی آمنے سامنے کھڑے ہیں اور لگاتار آپس میں لڑ رہے ہیں اور ایک دوسرے پر تہمت رکھ رہے ہیں۔ ان میں جو بڑا ہے وہ چھوٹے کو ڈانٹ رہا ہے اور جو چھوٹا ہے۔ وہ بڑے کو موردِ الزام قرار دے رہا ہے۔ میں بھی ان جھگڑالو پڑوسیوں کی طرح ہوں۔ دونوں کھڑکیوں پر جو چہرے ہیں وہ میرے اپنے ہی ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ ایک میں وہ رسول ہے جو کبھی جوان تھا اور دوسرے میں وہ رسول جو آج میں ہوں۔

زمانے کی آب وتاب نے میری آنکھیں چکا چوند کر دی تھیں بالکل اسی طرح جیسے ایک ناتجربہ کار نوجوان کسی خوش اندام دوشیزہ کی محبت میں اندھا ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی واقعات کو ایک ایسے ہی نوجوان کی نظر سے دیکھا، اور جس طرح اسے اپنی پسندیدہ لڑکی میں معمولی سی کمی بھی نظر نہیں آتی اسی طرح میں بھی اس معاملے میں اندھا بن گیا تھا۔ جیسے کہ کہاوت ہے ''جیسی چھڑی ویسی اس کی پرچھائیں۔'' تو سچ بات یہ ہے کہ میں بھی وقت کی پرچھائیں بن گیا تھا۔ قوموں کے درمیان نفرت کو ہوا دیتا تھا اور جس گھر میں یہ بات کہی جا رہی تھی، میں نے اس پر اور گھر کے مالک پر اعتبار کیا اور یہ اسی اعتبار کا نتیجہ تھا کہ میں نے وہ نظم لکھی جس میں ہمارے شاہ میل کا ''پردہ فاش'' کیا گیا تھا۔

آج کچھ لوگ میری تسلی کے لیے کہتے ہیں:

''ہم نے سنا ہے کہ تم نے وہ اشعار خصوصی ہدایت پر لکھے تھے اور تمہیں ان اشعار کی تخلیق پر مجبور کیا گیا تھا۔''

لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ کسی نے مجھ پر دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ یہ میں خود تھا، جس نے اپنی آزادانہ خواہش پر شاہ میل کے بارے میں وہ اشعار لکھے تھے اور انہیں لے کر اخبار کے دفتر گیا تھا۔ میری حیثیت پہاڑی علاقوں کے ان باشندوں جیسی تھی جو قرآن شریف کے اوراق الٹتے جاتے ہیں حالانکہ انہیں عربی کا ایک لفظ بھی نہیں آتا، اس کے باوجود ایک لفظ سمجھے بغیر محض

قرآن کے اوراق الٹنے میں ایک طرح کی مسرت اور طمانیت محسوس کرتے ہیں۔

جی ہاں میں وقت کی پرچھائیں بن گیا تھا حالانکہ شاعر کو کبھی پرچھائیں نہیں بننا چاہیے اسے تو شعلہ ہونا چاہیے، روشنی کا سرچشمہ، اب اس سے بحث نہیں کہ یہ روشنی کسی معمولی دیے کی ہے یا سورج کی۔ روشنی پرچھائیں نہیں ہوسکتی وہ تو صرف روشنی ہوتی ہے۔

میں غالباً ان ساری باتوں سے کچھ دیر میں واقف ہوا۔ سیب طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ بعض سیب جلدی تیار ہو جاتے ہیں اور بعض خزاں میں ہی جا کر کہیں اس قابل ہوتے ہیں کہ انہیں کھایا جاسکے۔ غالباً میں بھی اسی طرح کا سیب ہوں جو خزاں میں تیار ہوتا ہے۔

یہ تھا سارا قصہ۔ اب رہی میرے زخم کی بات تو وہ آج بھی تازہ ہے اور آج بھی اس کی کسک دل میں محسوس ہوتی ہے۔

برسوں پہلے، دل پر میرے زخم لگا تھا
اب بھی اکثر نشتر بن کر جاگ اٹھتا ہے
وہ جو میرے دادا کے پاک ہونٹوں پر
گیت بنا تھا، قصہ بن کر گونج اٹھا تھا
اک قصہ، اور اس کا ہیرو، بچپن کا حصہ بن کر
میری یادوں کے آنگن میں
آنکھ مچولی کھیل رہا ہے
میرے گھر کے آگے
کھیتوں میں، میدانوں میں
شام کی دھندلی تاریکی میں
اس کی فوجوں جیسے بادل
ہر لحظہ اُمڈے آتے ہیں
وہ میرے کوہستان کا نغمہ، جس کو

میرا بچپن، ماں کے ہونٹوں سے سنتا آیا
میری ماں کے بوجھل آنسو
جن کو کبھی وہ روک نہ پائی
شبنم کے قطروں کی صورت
میرے کھیتوں، میدانوں میں بکھرے ہیں
بوڑھا، ویر، بہادر
قفقازی ٹوپی اوڑھے دیکھ رہا ہے
اک اونچی دیوار سے نیچے جھانک رہا ہے
بائیں ہاتھ سے پکڑے اپنی دو دھاری تلوار کا قبضہ
دائیں جانب ڈول رہا ہے میان کا سایہ
ہاں میری یادوں میں اب بھی
وہ تصویر مچل اٹھتی ہے
جس نے دیکھا
مجھ سے بڑے دو بھائی میرے
کیسے رن کی سمت سدھارے
کیسے میری اپنی بہن نے
سونے کا نیکلس اور ہار اتارے
دان میں بخشے
تاکہ ایسا ٹینک بنے
جس پر بوڑھے، ویر، بہادر
قفقازی ٹوپی والے
اس ہیرو کا نام کھدا ہو

اور ابا نے، اپنی موت سے کچھ دن پہلے
اس ہیرو کے گن گائے تھے
لیکن یہ بھی سچائی ہے
کڑوی، لیکن سچائی
اس ہیرو کو دشمن کا ایجنٹ بتا کر
اک دنیا نے اس کے سر الزام تراشے
میرا تو یہ بھی کہنا ہے
ابا پر یہ چوٹ نہ پڑتی تو کچھ دن وہ اور بھی جیتے
لیکن!
ہائے! خود میرا بھی ہاتھ ہے اس میں
میں نے بھی باتوں میں آ کر
اوروں کے ہمراہ چلائیں
شعروں کی شمشیریں اس پر
وہ تلوار اجداد کی میرے
جو دشمن کے خوں میں نہائی
اس کو میں نے
لوگوں کی باتوں میں پڑ کر
غداروں کا حربہ سمجھا
دشمن کا ہتھیار بتایا
اب بھی رات کی خاموشی میں
اس کے بھاری قدموں کی آہٹ ملتی ہے
جب دیپک بجھ جاتے ہیں

کھڑکی میں سے اس کا سایہ
وہ جس نے جم کرا خلگوں کی آن بچائی
گونیب کا درویش سپاہی
آ جاتا ہے، خود میرے اپنے کمرے میں
آ جاتا ہے، اور یہ کہتا ہے
کتنی جنگیں لڑتا آیا
کتنا خون بہایا میں نے
کتنا درد اٹھایا میں نے
میرے بدن پر، میری قبا پر
انیس زخموں کے پیوند اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں
پھر بھی میں نے صبر کیا تھا
لیکن تم نے
شعروں کے یہ تیر چلا کر
زخم لگایا ہے ایسا
جیسا زخم کبھی نہ کھایا
خنجر کے، تلوار کے اور گولی کے زخم ایک طرف
اور یہ زخم اک جانب
یہ پہلا زخم اک جانب
یہ پہلا زخم ہے جو میں نے
اپنے کوہستان کے اک بیٹے کے ہاتھوں کھایا
تم نے وہ جو تیر چلایا
میرے دل میں جا اترا ہے

ہوسکتا ہے غزوہ اور جہاد کے نعرے

اب فرسودہ سمجھے جائیں

لیکن میرے بچے!

ان نعروں نے

ایک دن تیرے

کوہستان کی حرمت اور اس کا ناموس بچایا

ہوسکتا ہے، آج کی دنیا

ان حربوں کو کہنہ سمجھے

لیکن یہ وہ حربے ہیں

جو آزادی کے ضامن بن کر

رن کے میدانوں میں چمکے

دشمن پر طوفان سے ٹوٹے

میں کوہستانی شاہین بن کر

ہر پل جنگ کے میدانوں میں لڑتا آیا

گانا سننے

جشن منانے کی فرصت کب پائی میں نے

یہ بھی سچ ہے، اک شاعر کو کوڑے بھی لگوائے تھے

یہ بھی سچ ہے، میرا وہ اقدام غلط تھا

غصے میں بے قابو ہونا کوئی اچھی بات نہیں ہے

لیکن مجھ کو

تم جیسے پھوہڑ شاعر جب ملتے ہیں

جن کے گیتوں، نظموں اور شعروں میں

کھوکھلا پن ہو

تو میرا یہ جی ہوتا ہے

میرے ہاتھ میں کوڑا ہوتا

تو وہ فسانہ پھر دہراتا

یوں ہی سحر تک یہ وہ سایہ

جو ہر شب اندھیارے میں

اپنی حنا آلودہ داڑھی

چہرے کی تابانی لے کر

میرے کمرے میں آتا ہے

منڈلاتا ہے

طنز کے لاکھوں تیر چلا کر

مجھ کو اپنے زخم دکھا کر

شرم کا اک احساس دلا کر

جانے کہاں پھر چھپ جاتا ہے

میں نے جو حرکت کی تھی

اس حرکت پر نادم ہوں

اس سائے سے بھی نادم

جو ہر شب تاریکی میں منڈلاتا ہے

اور اپنے لوگوں سے بھی

بوڑھے، ویر، بہادر کا

اس غزوے میں اک ساتھی تھا

حاجی مراد

جس نے اپنے پیر سے رشتے توڑ لیے تھے
بعد میں اس کو غلطی کا احساس ہوا تھا
پیر سے وہ ملنے کو چلا تھا
لیکن اک دلدل میں پھنس کر

بیچارہ
اپنی جان گنوا بیٹھا تھا
میں بھی گر دوبارہ چاہوں
اس کی خدمت میں جانا
تو ناممکن ہے
کیونکہ، میرے اور اس کے بیچ میں حائل
اک دریا ہے، وقت کا دریا
اس کا رستہ، اس کا رستہ تھا
میرا رستہ، میرا رستہ ہے
اب تو مجھ کو اپنے ان اشعار کی قیمت
شب بیداری
شرم وندامت سے ہی پوری کرنی ہوگی
یہ بھی سچ ہے
معافی کی کچھ آس اگر ہو
سب کچھ کر سکتا ہوں
لیکن ڈرتا ہوں
کوئی دلدل
میرے بھی اس راہ گزر میں

آدھمکی

تو کیا ہوگا؟

لیکن اک سچائی

اس سے بھی کچھ زیادہ برتر سچائی

یہ ہے

اک شاعر کی غداری کو معافی دینا وہ کیا جانے

جو تلوار سے لکھتا ہو

آنے والے دور کے قصے

آنے والے دور کے نغمے

اور اب اس سے معافی کی درخواست بھی کرنا

اک سعی لاحاصل ہوگا

اب تو مجھ کو جیتے جی

اپنی جبیں کا یہ دھبہ

اپنا یہ آلودہ دامن

غلطی کے احساس کا بوجھ

ان کاندھوں پر ڈھونا ہوگا

لیکن! میری قوم کے لوگو!

یہ بوجھ اتنا ہی رکھو

جتنا میں ڈھو پاؤں یا سہ پاؤں

میں نادم ہوں، لیکن اے محبوب وطن

مجھ پر

ایسی تیکھی نظروں کے تیر نہ برسا

جیسے کوئی ماں، بچے کی بے جا حرکت پر
خود شرمندہ ہو جاتی ہے
یاس والم میں کھو جاتی ہے

مجھے نہیں معلوم کہ داغستان کے لوگوں نے یا شاہ میل کی روح نے مجھے میرے پرانے اشعار کے لیے معاف کر دیا ہے یا نہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میرا ضمیر مجھے کبھی معاف نہیں کر سکتا۔

"شاہ میل سے مت الجھو۔"

ابا کہا کرتے تھے: "اگر تم نے ایسا کیا تو زندگی بھر سکون نہ پا سکو گے۔"
ابا نے کتنی صحیح بات کہی تھی۔

(میرا داغستان: رسول حمزہ توف)

**باب نہم:**

# آخری معرکہ

معاہدۂ پیرس پر دستخط کے بعد روس کو ایک بار پھر قفقاز کو مُسخر کرنے کے لیے اپنے پورے وسائل استعمال کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ بیرونی حملہ آوروں کے خطرے کے ٹل جانے کے بعد رُوس کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنی سرحدوں کو قفقاز کے مجاہدوں کی چھاپہ مار کارروائیوں سے محفوظ کر سکے۔ پرنس بیریاٹنکی کو قفقاز کا وائسرائے اور کمانڈر انچیف مقرر کر دیا گیا اور ملوٹین اس کا چیف آف سٹاف مقرر ہُوا (۲۲ جولائی ۱۸۵۶ء) اس اثنا میں روسیوں کی پوزیشن قفقاز میں مختلف وجوہ سے خاصی بہتر ہو چکی تھی۔ ایک تو فوجی چھاؤنیوں اور قلعوں کی تعمیر کی وجہ سے سرحد محفوظ ہو چکی تھی، دوسرے یہ کہ درختوں کی بڑے پیمانے پر کٹائی کی وجہ سے وہ خطرات جو اس سے پہلے مہمات میں پیش آتے رہے تھے خاصی حد تک ٹل چکے تھے۔ سڑکیں بھی بہتر ہو چکی تھیں۔ لیکن سب سے اہم بات یہ تھی کہ خود قبائل میں امامؒ کی تحریک کا پہلا سا زور نہ رہا تھا۔

## تحریک مریدیّت کو درپیش مُشکلات:

کسی بھی تحریک کے لیے خاموشی کا دور حقیقت میں بددلی کا دور ہوتا ہے۔ جب تک تحریک پورے زوروں پر کام کرتی رہے، کارکنوں کے حوصلے بلند رہتے ہیں ہر کامیابی خوشی کا نیا پیغام لے کر آتی ہے اور کام کرنے کا ولولہ اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ کارکن مزید جدّ وجہد کرتے ہیں اور اس طرح مزید کامیابیوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

اس کے برعکس اگر مہمات کا سلسلہ بند ہو جائے تو صلاحیتوں کو زنگ لگ جاتا ہے، لوگوں کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں اور دشمن کا رُعب بڑھ جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ترقی رُک جانے سے کام وہیں کا وہیں نہیں رہتا بلکہ ایک طرح کی ترقی معکوس شروع ہو جاتی ہے۔ کسی بھی تحریک کے قائد کے لیے سب سے مشکل مرحلہ یہی ہوتا ہے کہ کس طرح TEMPO یا

تحریکی رفتار کو برقرار رکھا جائے اس طرح کہ نہ تو بہت زیادہ کام کرنے کی وجہ سے اُس کے رُفقا بالکل تھک جائیں اور نہ بیکار رہنے کی وجہ سے ان کی صلاحیتوں کو زنگ لگ جائے۔

سیّد احمد شہید کو بھی اپنے دور میں اسی قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا تھا اور ان کے بعد بھی ان کی جماعت مجاہدین کو نسبتاً خاموش دور میں اسی نوع کے مسائل درپیش آئے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ ہم تو گھر سے اس لیے آئے تھے کہ جہاد میں شامل ہوں گے اور یہاں جہاد کا نام ونشان بھی نہیں۔ اگر ان مواقع پر چھاپہ مار مہمات کا سلسلہ باقاعدہ جاری رہتا تو شاید تحریک کے لیے خاصا مفید ثابت ہوتا۔ تحریک کے رہنما کی نظریں اُفق کے پار جن حقیقتوں کا مشاہدہ کر رہی ہوتی ہیں بسا اوقات عملی سُوجھ بوجھ نہ رکھنے والے ساتھیوں کی نظر وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ وہ مستقبل کے پردے میں جھانکنے کی صلاحیت نہیں رکھتے جب تک قائد اپنے ساتھیوں کے دل میں یقین کی وہ مشعل فروزاں رکھے جس کی لو میں وہ آنے والے واقعات کو دیکھ سکیں اس وقت تک تحریک پھلتی پھُولتی رہتی ہے لیکن جُونہی یقین کی یہ مشعل مدھم ہونے لگتی ہے، طرح طرح کے شک اور شُبہات جنم لینے لگتے ہیں اور یہ صورت حال بالآخر تحریک کے حق میں دشمنوں کی یلغار اور حملوں سے بڑھ کر مضر ثابت ہوتی ہے۔

تحریک کی اشاعت اور پھیلاؤ کے دَور سے کہیں زیادہ کٹھن وہ دور ہوتا ہے جب کہ فتوحات اور مہمات کا دور ختم ہونے کو ہو اور اس کی بجائے سکون اور امن کا دور شروع ہو جائے۔ جہاد اور مسلسل جہاد ہی کسی تحریک کی بقا کا راز ہے۔

مرید تحریک کے پھلنے پھُولنے کا راز بھی اسی بات میں مضمر تھا کہ میدانِ جنگ میں مسلسل کامیابیاں نصیب ہوتی رہیں۔ دشمن کی تباہی تو ایک طرف رہی اگر ان میں کسی حد تک کمی بھی ہو جاتی تو یہ صورت حال روس کے حق میں جھکاؤ کے لیے مُعاون ثابت ہو سکتی تھی۔ پھر امامؒ کے طوفانی دستوں کے لیے بھی یہ صُورت خاصی مایوس کُن تھی۔

رُوسیوں کے منصوبے:

دوسری طرف رُوسیوں نے نصف صدی کی مسلسل کوششوں کے بعد اپنی ناکامی کے

اسباب کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ روسیوں کی جنگی تنظیم میں ایک بڑی خامی یہ تھی کہ فوجیں انتظامی معاملات کے بارے میں ایک ایسے چیف کے ماتحت ہوتی تھیں جوان سے سیکڑوں میل پرے بیٹھا ہوتا اور وہ بھی احکامات کے لیے کمانڈر انچیف یا وائسرائے کا محتاج ہوا کرتا تھا۔ نتیجہ صاف ظاہر تھا۔ شمال میں واقع بائیں بازو کی افواج کی کمان ایک ایسے جنرل کے ہاتھوں میں تھی جو دور سٹاوروپول میں مقیم تھا۔ نئے کمانڈر انچیف بیریاٹنکی نے پہلا کام یہ کیا کہ پُورے قفقاز کی افواج کو پانچ مختلف حصوں میں بانٹ دیا اور ان کی کمان ایسے چیف کے سُپرد کی جو مکمل طور پر خودمختار ہو اور صرف اسی کے سامنے جوابدہ ہو۔ ان افواج میں سے تین کا تعلق مشرقی قفقاز سے تھا۔ بائیں بازو کی فوج جو چیچنیا کے بالمقابل تھی کیپسین کے سامنے والی فوج جس میں داغستان کی تمام سپاہ شامل تھی اور لسغین لائن کی فوج جو جنوب مشرق کے سلسلے کے ساتھ متعین تھی۔ ان تینوں کالموں کو ان تین مختلف مقامات سے بیک وقت روانہ ہونا تھا اور داغستان کے مرکز میں پہنچنا تھا۔ پہلی دو افواج کو شمال مشرق میں چیچنیا میں ملنا تھا اور بڑھ کر آندی دریا کی وادی میں تیسری فوج کے ساتھ شامل ہو جانا تھا۔ وڈوکیموف کی غیر معمولی کامیابیوں کی بنا پر اس منصوبے میں کسی حد تک ترمیم کرنا پڑی تھی۔ ان کامیابیوں نے اس کی موجودہ کمان کی اہمیت بڑھا دی تھی اور وہ پیش قدمی میں دیر سے ساتھ آ کر مل سکا۔

۱۸۵۷ء میں اس منصوبے کے مُطابق وڈوکیموف کی کمان میں بائیں بازو کی فوج چیچنیا کے زیریں علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ دوسری طرف پرنس اور بلیانی کی قیادت میں داغستان کی فوج سلاتو اور اوخ کے علاقوں کو تسخیر کر چکی تھی۔ لسغین (LESGHIAN) لائن کے کمانڈر بیرون ورسکی نے دیدو کے علاقے کو فتح کیا تھا اور ان تمام علاقوں میں سڑکیں بنالی گئی تھیں اور جنگلوں میں سے راستے بھی نکال لیے گئے تھے۔ سب سے اہم اقدام یہ تھا کہ بورتونائی پر قبضہ کر کے روسی داغستانی پیادہ رجمنٹ کے سٹاف کوارٹر کو وہاں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس مہم میں مریدین کے ۴۰۰ افراد اور دو نائب شہید ہو گئے تھے۔ ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ پہلی بار روسیوں نے رائفلوں کا استعمال کیا۔ مریدین کے پاس محدود پیمانے پر رائفلیں ابتدا ہی سے

موجود تھیں۔ نومبر کے وسط تک ولیم کی طرف جانے والے جنگل میں سے ایک بڑا حصہ کاٹ کر بڑی سڑک بنا دی گئی تھی اور نوتو نائی کے مقام پر ایک نیا قلعہ بن چکا تھا جس میں ۴ بٹالین رہائش اختیار کر چکی تھیں۔

## بیریاٹنکی کے اقدامات:

۱۸۵۸ء میں بیریاٹنکی نے ارگاوٗں کی بالائی وادی پر قبضہ کر کے نہ صرف امامؒ کو ایک مضبوط گڑھ سے محروم کر دیا تھا بلکہ انھیں سارو ارگون کے مغرب میں واقع تمام قفقاز سے منقطع کر دیا تھا۔ اب صرف شمالی داغستان اور آندی اور اتکیریا کے ملحقہ اضلاع ہی امامؒ کے براہ راست کنٹرول میں رہ گئے تھے۔ دوسرے طرف انگوشی اور ارگون کے مغرب میں واقع چیچنیا کے قبائل کے لیے، جو دریائے ارگون اور تریک کے درمیان واقع تھے، سوائے روسیوں کی اطاعت کے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ مشرقی قفقاز کے مشرقی علاقوں سے بالکل منقطع ہو جانے کے بعد صورتِ حال امامؒ کے لیے خاصی نازک ہو چکی تھی۔

امامؒ کو کئی جگہ میدانِ جنگ میں شکست ہو چکی تھی۔ ان کے نائبین ایک ایک کر کے جامِ شہادت نوش کر چکے تھے اور کئی اضلاع نے روسیوں کی غیر مشروط اطاعت بھی قبول کر لی تھی۔ لیکن پھر بھی امامؒ جیسے باصلاحیت لیڈر کے لیے جن کے پاس اب بھی خاصی تعداد میں مریدوں کی فوج موجود تھی، جنگلوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں میں ہمت کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کرنا مشکل نہ تھا۔ صرف ایک شرط تھی اور وہ یہ کہ مقامی آبادی ان کا ساتھ دے اور حوصلہ نہ ہارنے کے ساتھ اپنے تمام وسائل کو امامؒ کے سپرد کر دے۔ یہ آخری بات ہی ایسی تھی جس نے امامؒ کا ساتھ نہ دیا۔

## رُوسیوں کی پیش قدمی:

امام مفتوحہ قبائل سے بھی رابطہ قائم کیے ہوئے تھے اور ان کا جاسوسی کا نظام خاصا مضبوط تھا۔ لیکن وڈوکیموف نے اس موقع پر ایک ایسی چال چلی کہ امامؒ آخر وقت تک اس کی افواج کی سمت متعین نہ کر سکے۔ اس میں شک نہیں کہ انھیں افواج کی تیاری اور روانگی کا قبل از وقت پتہ

چل چکا تھا لیکن ان کا یہ خیال تھا اور حقیقتاً وڈو کیموف نے بھی اپنی افواج کو یہی بتایا کہ ارگون کے مشرق میں ۲۰ میل کے فاصلے پر اختوری کے مقام پر حملہ کیا جائے گا۔ صرف کمانڈر اور اس کے قریبی افسروں کو ہی اصل مقصد کا علم تھا اور یہ بات اس حد تک صیغۂ راز میں رہی کہ دو کالم جو بیرویکل کے مقام پر ۱۵ جنوری کی رات کو روانہ ہوئے اپنی منزل مقصود سے بالکل ناواقف تھے۔ وہ تمام رات سفر کرتے رہے اور برف کو عبور کرنے کے بعد ارگون کے دائیں کنارے پر ایک بُرج کے پاس پہنچے۔ یہاں وہ ایک تنگ درے میں داخل ہونے والے تھے کہ انھوں نے وڈو کیموف کی ذاتی قیادت میں ایک تیسرے کالم کو دریا کے بائیں کنارے پر دیکھا۔ اسی آخری کالم کو تنگ درے کے پاس چیچنیا کے بہادُر مجاہدین سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ مجاہد اس پوزیشن پر ڈٹے رہے۔ لیکن انھیں اخیر وقت میں اس بات کا علم ہوا کہ دریا کی دوسری جانب سے بھی دو کالم آگے بڑھ رہے ہیں۔ اب صُورت حال خاصی نازک ہوگئی تھی۔ گھیرے سے بچنے کے لیے انھوں نے پسپائی اختیار کرلی۔

اس درّے پر قبضہ ہو جانے کی اطلاع سے مقامی آبادی، جو اب تک رُوسیوں کی مخالف تھی، رُوسی افواج کے خیر مقدم کے لیے جوق در جوق آنے لگی۔ یہ درہ ناقابل شکست سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے مقامی آبادی کے حوصلے پست ہو گئے۔ ایک وقائع نگار لکھتا ہے کہ مقامی آبادی نے اپنی پیداوار رُوسیوں کے ہاتھ بیچنا شروع کر دی اور کچھ دیر میں یہ درّہ بازار کی شکل اختیار کر گیا۔

کہا جاتا ہے کہ امامؒ کو درّے پر روسی قبضے کی اطلاع دی گئی تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے انھیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اب آخری وقت آن پہنچا ہے۔ اس وقت بھی مریدین کی اچھی خاصی جمعیت ان کے ساتھ تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے جوابی حملے کی کوشش کیوں نہیں کی! کئی ہزار داغستانی اب بھی ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھے اور اس سے پہلے کہ روسی اس تمام علاقے کو مفتوح کر لیتے، امامؒ رُوسیوں کو شکست دینے کی اہلیت رکھتے تھے۔ لیکن امامؒ نے کچھ نہیں کیا۔ دوسری طرف روسیوں نے بڑی تعداد میں درختوں کی کٹائی شروع کر دی تھی۔ ہر

روز سیکڑوں درخت کٹ کٹ کر گر رہے تھے۔ روسی کلہاڑیوں کی آواز یخ بستہ فضاؤں میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی اور یہ آواز توپوں کی گرج سے بھی کہیں زیادہ دل شکن تھی۔

دارگان دوخ کی بلندی تک ۱۴۰۰ گز چوڑی جگہ صاف کی جا چکی تھی۔ یہ چوٹی ۶ ہزار فٹ بلند تھی اور یہاں سے دس میل دُور امامؒ کے گھر ویدن کا میدان روسیوں کو صاف نظر آ سکتا تھا۔

دوسری اطراف میں بھی جنگل کاٹے جا رہے تھے، پُل بنائے جا رہے تھے اور آرگونسکی کے مقام پر ایک قلعہ بھی تعمیر کیا جا چکا تھا۔ امامؒ کا کمزور توپخانہ اپریل تک اس قلعے کو ختم نہیں کر سکا تھا۔ روسی کمانڈر اس قلعے میں خاصی تعداد میں فوج کو چھوڑ کر ووڈیشنکو اور گروزنی کی طرف پسپا ہو گیا۔ موسم سرما کی مہم کامیاب رہی تھی اور اب افواج کچھ عرصہ آرام کے لیے واپس جا رہی تھیں۔

جون ۱۸۵۸ء کے آخر تک تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں اور یکم جولائی کو روسی افواج ایک بار پھر ارغون کے تنگ درّے میں داخل ہو گئیں۔ لیکن اب تک بہت کچھ بدل چکا تھا۔ دیوقامت درخت کٹ چکے تھے۔ ندیوں اور دریاؤں پر پُل بن چکے تھے۔ ہر سمت سڑکیں بن چکی تھیں اور مجاہدین کسی جگہ بھی رستہ روکنے کے لیے موجود نہ تھے۔ حالانکہ چھ ماہ پہلے اسی درے کو عبور کرنے کے لیے روسیوں کو بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس بات نے روسی کمانڈر کے حوصلے کو بہت بلند کر دیا تھا۔

اس مقام سے آگے راستہ کچھ زیادہ بہتر نہیں تھا۔ دریا سیکڑوں فٹ گہرے کھڈوں میں گزرتا ہُوا کئی جگہ ناقابل عبور ہو گیا تھا۔ اس راہ کی مشکلات اس قدر زیادہ تھیں کہ اگر کہیں بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا جاتا تو اس سے گزرنا قریباً ناممکن تھا۔ اسی دوران وڈوکیموف کے جاسوسوں نے اسے اطلاع دی کہ سامنے والے جنگل میں مجاہدین رکاوٹیں اور خندقیں بنانے میں مشغول ہیں تاکہ دشمن کو یہ راستہ عبور نہ کرنے دیا جائے۔ لیکن جنرل ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو صرف سامنے ہی سے حملہ کرنے کے قائل ہوں۔ اس نے پہلے دائیں کنارے پر اپنی افواج کو گزرنے دیا اور پھر اچانک اپنی فوج کے بڑے حصے کو دریا کی بائیں جانب اُتار کر مسکین

دوخ کی چوٹی کو معمولی نقصان سے سر کر لیا۔ اس کے بعد وہ یہاں سے اُترا اور وارنڈا کے دیہات کی جانب ہولیا۔ ان دیہاتوں نے فوراً اطاعت تسلیم کر لی۔ بعد ازاں اس نے دریا کو دوبارہ عبُور کیا اور ذوناخ کے گاؤں میں ایک عارضی قلعہ تعمیر کیا اور ایک سڑک کے ذریعے اگونسکو کے قلعے اور اس جگہ کو آپس میں ملا دیا۔ شاتو کو جانے والے راستے کا نصف حصہ روسیوں کے پاس تھا اور تھوڑی سی مزید کوشش کے ذریعے وہ باقی ماندہ راستے پر بھی قبضہ کرنے کے قابل ہو گئے۔ جولائی کے آخر تک روسیوں نے اس حصے کو عبور کر کے دفاعی فوج کو ورانڈا کے دیہات سے نکال دیا اور ان چوٹیوں پر دھاوا بول دیا۔ جنھوں نے شاتو کی وادی کو باقی علاقے سے الگ کر رکھا تھا۔

اس علاقے پر قبضے کے بعد مزید مزاحمت پیش نہیں آئی۔ رُوسیوں کے ہراول دستے نے خانتی دریا عبور کیا اور شانتو میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد روسی ذوناخ اور اگونسکو کے درمیان رسل و رسائل کا سلسلہ قائم کرنے کی کوشش میں مشغول ہو گئے۔ رُوسیوں کی ان کامیابیوں کو دیکھ کر مقامی دیہات نے جو پہلے ہی تذبذب میں تھے، بالکل ہی ہمت ہار دی۔ انھیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ اب روسی کامیاب ہونے والے ہیں۔ وہ مرغِ قبلہ نُما کی طرح ہوا کا رُخ دیکھ کر بدل گئے۔

### مقامی افراد کی غدّاری:

انگریزی محاورے کے مصداق ''کامیابی سے زیادہ کوئی چیز کامیاب نہیں ہوتی۔'' یہاں بھی رُوسیوں کی ایک کامیابی دوسری کامیابیوں کا پیش خیمہ بنتی گئی۔ کوفہ کے لوگوں کی طرح مقامی دیہاتیوں کے دل بھی امام شاملؒ کی طرف اور تلواریں روسیوں کے ساتھ تھیں۔ ان لوگوں نے امامؒ کے ساتھ کُھلی غداری کی اور شاہ سے زیادہ شاہ پرستی کا ثبوت دیتے ہوئے کئی جگہ امامؒ کے ساتھیوں کو شہید کر دیا۔ ایتوم قلعہ کے لوگوں نے امامؒ کے نائب کو قید کر لیا، ان کے بھائی اور دوسرے مریدوں کو شہید کر دیا اور رُوسیوں کو یہ پیغام بھجوایا کہ جلد از جلد آ کر قلعہ اور اس کی توپ پر قبضہ کر لیں۔ ارغون کا بالائی علاقہ اب روسیوں کے قبضے میں آ گیا تھا اور داغستان پہنچنے

کے لیے ایک نیا رستہ کُھل گیا تھا۔

اور بلیانی کی جگہ رینگل نے لے لی تھی اور اسی دوران اس نے داغستان سے آگے بڑھ کر گمبیٹ اور اوخ کے باقی ماندہ علاقے پر قبضہ کرلیا تھا۔ دوسری طرف ریولسکی نے پچھلے سال کی طرح دیدوز کے علاقے پر چڑھائی کی اور پورے علاقے کو روسی روایات کے مُطابق ایک بار پھر آگ اور خُون میں نہلا دیا۔ وہ خود کیتوری کے گاؤں پر حملے کے وقت ہلاک ہو گیا لیکن اس کا کام مکمل ہو چکا تھا اور اس کے بعد پرنس میلیکوف نے پیش قدمی کی تو اسے پہاڑی رستوں اور جنگلوں کے سوا اور کوئی مشکل پیش نہ آئی۔

## نذران کا مُحاصرہ:

ارغون کی دوسری مہم کے دوران امام شاملؒ نے آخری بار زبردست حملہ کیا۔ نذران کے لوگوں نے جو اس سے پہلے رُوسیوں کے حلیف تھے، امام شاملؒ کی مدد طلب کی اور آزادی کا علم بلند کر دیا۔ امامؒ نے خانتی کا دریا عبُور کیا اور ووڈ کیموف کی توپوں کے فائر کے باوجود میدانوں کی راہ لی لیکن احکوئی کے مقام پر انھیں نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا اور چونکہ اب نذران ایک بہت دور دراز سفر کے ذریعے ہی پہنچا جا سکتا تھا، اس لیے وہ واپس ہو گئے۔ اسی دوران نذران کی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے روسی دستے پہنچ چکے تھے۔ نذران کو گھیرے میں لے لیا گیا اور روسی رسالے نے چھ توپوں کی مسلسل فائرنگ کی مدد سے اس گاؤں کو فتح کر لیا۔ تحریک آزادی کے چار علمبرداروں کو پھانسی دے دی گئی اور ۴۰ بچوں کو یرغمال کے طور پر قفقاز لے جایا گیا جہاں ان سے بڑا بے رحمانہ سلوک کیا گیا، جب یہ بچے وطن واپس آئے تو ان کے دل ظالموں کے خلاف نفرت سے بھرپور تھے اور وہ ایک بار پھر بغاوت کے لیے آمادہ تھے۔

چھ ہفتے بعد امامؒ نے اس بات کی بھرپور کوشش کی کہ روسیوں کی توجہ کسی دوسری طرف مبذول کروا دی جائے تاکہ وہ پسپائی اختیار کر لیں۔ اس غرض کے لیے انھوں نے ۴ ہزار سواروں کے ساتھ نذران پر اچانک حملہ کر دیا۔ اس بار مریدین کو خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔ ۳۷۰ مریدوں نے جامِ شہادت نوش کیا جب کہ دوسری طرف روسیوں کے صرف ۶ اسپاہی ہلاک اور

۲۶ سپاہی زخمی ہُوئے۔

## رُوسیوں کی فتح کے اسباب:

پرنس بیر یاتنگی نے جنگ کے خاتمے پر وڈوکیموف کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ روسیوں کے نئے طریق جنگ پر خاصی روشنی ڈالتا ہے۔

وہ لکھتا ہے:

"ووڈ کیموف نے دشمن کو ایک بار بھی اس جگہ جنگ لڑنے کا موقع نہیں دیا جہاں دشمن فائدے میں رہتا۔ امام شاملؒ اور ان کے ساتھیوں کی انتہائی مضبوط پوزیشنیں محض سوچی سمجھی چالوں کے ذریعے ہاتھ آ گئیں۔ اخالگو، سالتی، غرغیبل اور توخ کے محاصرہ میں ہزاروں روسیوں کو جان دینا پڑی تھی جب کہ ویدین پر قبضے کے لیے جہاں شاملؒ نے اپنے تمام تر قوت جمع کر رکھی تھی، ہمارے صرف ۲۶ افراد ہلاک اور زخمی ہوئے۔ تین چیزیں ایسی تھیں جنھوں نے جنگ جیتنے میں ہماری مدد کی۔ پہلی چیز باضابطہ طریقے سے جنگ لڑنا۔ دوسری جرنیلوں کی جنگی چالوں کا درست ہونا اور تیسری قفقاز کی افواج کا رائفل سے مسلح کیا جانا۔ ان تین چیزوں نے قفقاز میں فتح کا راستہ کھول دیا۔ ان کوہستانیوں کا مقابلہ جنگ سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مستقل جنگوں کی وجہ سے ان کا حوصلہ اس قدر بلند ہو چکا تھا کہ چند درجن آدمی ہمارے بڑے بڑے کالموں کو روکنے کے قابل تھے اور ہماری سیکڑوں گولیوں کے جواب میں چند گولیوں سے کہیں زیادہ نقصان پہنچا سکتے تھے۔ لڑائی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دونوں طرف برابر کی چوٹ ہو۔ لیکن جب بار بار ایسا ہوا کہ انھیں سرے سے لڑنے کا موقع ہی نہیں ملا تو ہتھیار ان کے ہاتھوں سے گر پڑے۔ اگر لڑائی کا موقع پیش آتا تو وہ ہارنے کے باوجود دوبارہ مقابلے کے لیے تیار ہو جاتے۔ لیکن جب انھیں لڑائی کے بغیر مُنتشر ہونا پڑا تو اس بات سے ان کے حوصلے پست ہو گئے اور انھوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ امام شاملؒ کی قوت ختم

ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کی فوجیں ایک جگہ اکٹھی ہوتیں اور پھر انھیں لڑائی کیے بغیر منتشر ہونا پڑتا۔ کہیں بھی باقاعدہ لڑائی نہ ہوتی۔ آخری تین سالوں میں مسلسل مہمات کے باوجود زار کے سپاہیوں کا کسی بھی جگہ بھاری جانی نقصان نہیں ہُوا۔ جنگ کے تمام برسوں میں یہ سال سب سے کم خونیں واقع ہوئے ہیں۔"

## امامؒ کے ساتھیوں کی علیحدگی:

رُوسیوں کی مسلسل فتوحات نے عوام میں بُزدلی پیدا کر دی تھی۔ ان میں مزید مقابلہ کرنے کی جُرأت اور ہمت ختم ہو چکی تھی۔ وہی عوام جنھوں نے اس سے پہلے آخری دم تک رُوسیوں کا مقابلہ کیا تھا اور کسی قیمت پر ہار نہیں مانی تھی، اب بغیر لڑائی کے مفتوح ہوتے چلے جا رہے تھے۔ یہ عجیب واقعہ تھا۔ لیکن شکست کی نفسیات ہی عجیب ہوتی ہے۔ رُوسیوں کی پے در پے کامیابیوں نے ان کے ایمان کو متزلزل کر دیا تھا اور ان میں وہ ہمت اور جوانمردی ختم ہو چکی تھی جس کا ثبوت وہ گزشتہ نصف صدی سے دے رہے تھے۔ اس سے پہلے بھی ان قبائل نے روسیوں کے غلبے سے مرعُوب ہو کر اطاعت قبول کر لی تھی لیکن انتہا درجے کی مجبوری کی حالت میں اور اس وقت جب کہ ان کا بہت بڑا حصہ روسیوں کے ہاتھوں ختم ہو چکا تھا۔ ایسا بہت کم ہُوا تھا کہ انھوں نے بغیر لڑے بھڑے اتنی بڑی تعداد میں اطاعت قبول کر لی ہو۔

اتکیریا، تابرلوئی اور اوخ کے بالائی علاقے امامؒ سے کٹ کر رُوسیوں کے باج گزار ہو گئے تھے۔ جنوب میں انتسوخ میں رہنے والے آور اور شمالی ڈھلوانوں پر واقع دوسرے اضلاع نے بھی ہتھیار ڈال دیے تھے۔ امامؒ کے قریب ترین مُعتمد ساتھیوں نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ دانیال سُلطان نے ایک بار پھر غداری کی لیکن اب کے یہ روس کے حق میں تھی۔ یہی نہیں تلیتی کے قاضی کبیت ماہوما نے بھی مزید مقابلہ بے سُود سمجھا اور نہ صرف خود اطاعت قبول کی بلکہ سوداخر کے قاضی اسلان کو بھی گرفتار کر کے رُوسیوں کے حضور پیش کر دیا۔ اسلان تحریک مریدین کے انتہائی گرمجوش کارکنوں میں سے تھے۔

۱۴ جولائی کو بیریاٹنکی ووڈ کیموف سے ویدان سے پرے اس کے کیمپ میں ملا اور آخری پیش قدمی شروع ہوگئی۔ اس پیش قدمی میں ۴۰ ہزار افراد اور ۴۸ توپیں شامل تھیں۔

امامؒ اس سخت ابتلاء کے دور میں یونہی بیکار نہیں بیٹھے رہے۔ آزمائش کے اس کڑے وقت میں ان کا کردار انتہائی بلند رہا۔ انھوں نے ایک لمحے کے لیے بھی ہمت نہیں ہاری۔ روسیوں کی مسلسل کامیابیوں، اپنے لوگوں کی غداری، پورے پورے صُوبوں کا ہاتھ سے نکل جانا، دشمن فوجوں کی کثرت اور یہ احساس کہ ان کی قیادت ایک انتہائی قابل شخص کے ہاتھ میں ہے۔ ان کے عزم اور حوصلے کو پست کرنے میں ناکام رہا۔ انھوں نے اس صورت حال کے مقابلے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے۔

امامؒ چیچنیا کے پہاڑوں سے نکل کر ایک بار پھر داغستان کے علاقے میں داخل ہوئے۔ انھوں نے ایک لمحے کے لیے آرام نہیں کیا اور دفاعی انتظامات کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے میں دن رات ایک کر دیا۔ ایتکالی کے مقام پر قیام کے دوران انھوں نے اس جگہ کو قلعہ بند کیا اور آندی کے شمال میں دوسرے علاقوں کو بھی دفاعی اعتبار سے مضبوط بنانے کے بعد اس دریا کے راستے کو رینگل اور وڈوکیموف کے کالموں کے لیے بند کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے گرد و پیش کے تمام علاقوں سے کمک طلب کی۔ لیکن یہ تمام تیاریاں بے کار گئیں۔ وڈوکیموف آندی کے پہاڑ پر چڑھا اور چکر کاٹ کر بوتلخ کے بالمقابل پہاڑ پر آنکلا۔ آندی کی وادی میں لوگوں کو پہاڑ کی بلندیوں پر روسی سنگینیں چمکتی نظر آئیں تو شکست کا آغاز شروع ہوگیا۔ تابرلوئی کے لوگوں نے بیریاٹنکی کے پاس وفد بھیجا کہ انھیں رُوسی حفاظت میں اپنے گاؤں واپس جانے دیا جائے۔ امام شاملؒ کے نائب دبیر کی کوششوں کے باوجود وہ واپس چلے گئے۔ دوسرے دن آندی کے لوگ بھی امامؒ کا ساتھ چھوڑ گئے۔ امام کے بیٹے قاضی محمدؒ بھی ایتکالی کے قلعے کو ۱۱ توپوں سمیت چھوڑ کر کراتا چلے گئے۔ رینگل کے دستوں نے جلد ہی کوسولو اور آویریا پر قبضہ کرلیا اور تمام علاقے نے بآسانی اطاعت قبول کرلی۔

روسیوں کو اب پورے علاقے میں کسی قسم کی مزاحمت پیش نہیں آئی۔ اولو قلعے نے ازخود

ہتھیار ڈال دیے۔ غرغیبل کے نزدیک واقع اس قلعے نے مدّتوں روسیوں کو نزدیک پھٹکنے نہیں دیا تھا۔ ناقابلِ تسخیر اوخ بھی اسی دن فتح ہو گیا۔ ۲۸ جولائی کو کبیت ماہو ما گلوتی آیا اور روسی ہر اول دستے کو لے کر جس کی قیادت جنرل راکوس کر رہا تھا، اپنے آبائی گاؤں تلیتی پہنچا۔ یہ دیکھ کر بالائی آور کے علاقوں نے بھی اطاعت قبول کر لی۔ ۷ اگست کو دانیال سلطان، جس نے پہلے ہی اریب اور دُوسرے قلعوں کو رُوسیوں کے حوالے کر دیا تھا۔ بیریاٹنکی کے کیمپ میں پہنچ کر معافی کا خواستگار ہُوا۔

امامؒ یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ان کے قریب ترین ساتھی روسیوں کے آگے جھک گئے تھے۔ ان کی تحریک خزاں رسیدہ پتوں کی طرح روسیوں کی بادِ خنک کے ایک ہی جھونکے سے تتر بتر ہو چکی تھے۔ ان کے بہادر سپاہی پہاڑوں پر پڑی برف کی طرح غائب ہو چکے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ غونیب پہنچے۔ راستے میں ایک بدنام گاؤں آخواخ (یہ گاؤں مہمان نواز نہ ہونے کے باعث اور اپنی دوسری بُری حرکتوں کی وجہ سے پورے علاقے میں بدنام تھا) کی عورتوں نے ان کے سامان کا کافی حصہ چُرا لیا اور روجہ کے قریب کبیت ماہو ما کے ساتھیوں نے ان کا باقی ماندہ سامان بھی چھین لیا۔ وہی شخص جو کل تک ان کا مُعتمد ترین ساتھی تھا، آج ان کی عزت و حرمت کے درپے تھا۔ لٹے پٹے حال میں جب امامؒ یہاں پہنچے تو انھوں نے انھیں خوش آمدید کہا۔ ان دہقانوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ روس کی تمام تر قوت ان کے دیہات کو روند ڈالے گی لیکن انھوں نے اس کے باوجود آخر دم تک امامؒ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔

امامؒ کے ساتھیوں میں اب صرف ۴۰۰ افراد باقی رہ گئے تھے۔ ان حالات میں بھی امامؒ نے دیہات کی دفاعی پوزیشن کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کا فیصلہ کیا۔ ان افراد کے ساتھ انھوں نے مورچے کھودے، پتھروں سے رکاوٹیں تعمیر کیں اور اس آخری محاذ کو مضبوط بنانے کے لیے تمام تر قوتیں صرف کر دیں ان پر ماضی قریب میں جو گزری تھی اسے یاد کرتے ہوئے وہ عرب شاعر کے یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

"میں نے اپنے بھائیوں کو زنجیروں کی کڑیوں سے زیادہ اپنے آپ سے منسلک

سمجھا تھا۔ وہ بھی میرے دشمن بن گئے ہیں۔ میں نے انھیں تیز تیروں کی طرح سمجھا تھا۔ وہ تیز تیر ہی تو تھے، لیکن ایسے جو میرے دل میں پیوست ہو گئے۔"

۱۹ اگست کو رینگل پہنچا اور محاصرہ شروع ہو گیا۔ اگلے دن پرنس بیریاٹنکی، وڈوکیموف اور اس کے سٹاف افسر اور روسیوں کے حفاظتی دستے اور مقامی رسالے کے ہمراہ اطاعت گزار علاقے کے معائنے کے لیے نکلے۔ اگالی سگر تیل، تنکاٹ اور اشیلتا سے ہوتا ہوا یہ قافلہ انتوکول اور غمری بھی پہنچا۔ یہاں پرنس روسی حفاظتی دستے کو چھوڑ کر باقی ماندہ سفر میں صرف اپنے سٹاف اور کوسوبو اور آویریا کے باشندوں کے ہمراہ چل پڑا۔ دو روز بعد وہ گولوتل کے مقام پر کبیت ماہوما سے ملا اور تلیتی جا کر اس کے گھر کھانا کھایا۔ اس رات اس نے تیموران کے پہاڑ کے دامن میں خیمے لگائے اور ۱۸ اگست کو روجہ اور توخ کے معائنے کے بعد غونیب کے اُوپر پہاڑ کی چوٹی پر رینگل سے آملا۔ اس تمام سفر کے دوران اسے ہر جگہ خوش آمدید کہا گیا اور اس کا خیر مقدم ہوا۔

آخری پناہ گاہ:

امام شاملؒ کی آخری پناہ گاہ کا اندازہ اس نقشے سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہر جانب چٹانوں کی بڑی بڑی دیواریں ۴ ہزار سے ۵ ہزار فٹ تک بلند ہیں، جب کہ یہ مغرب کی جانب سے ۱۸۱۷ فٹ تک پہنچ جاتی ہیں۔ ان دیواروں کے درمیان سطح زمین ایک پیالے کی نچلی سطح کی طرح گہری ہے۔ اس کے گرداگرد اُونچے اُونچے پہاڑوں کی فصیلیں ہیں اور یہاں پانی وافر مقدار میں موجود ہے۔ باجرہ، جوار اور مکئی کے علاوہ یہاں ہر طرح کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ ان دنوں جب دُور مار توپیں ایجاد نہیں ہوئی تھیں، غونیب کی حیثیت ایک قدرتی قلعے کی سی تھی۔ اگر یہاں کافی تعداد میں دفاع کے لیے لوگ موجود ہوتے تو اس جگہ کو ناقابل شکست بنانا کچھ مشکل نہیں تھا۔ لیکن امامؒ کے پاس اس وقت صرف ۴۰۰ افراد تھے۔ یہاں دس مختلف جگہوں پر کمپنیوں اور کئی جگہ پر بٹالینوں کے ذریعے بیک وقت حملہ کیا گیا تھا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ کئی جگہ پوری بٹالین کے مقابلے میں صرف ۴۰ افراد رہ جاتے تھے اور وہ بھی تقریباً ۱۲ میل

کے دائرے میں پھیلے ہوئے تھے۔ اگر یہاں ۴۰۰۰ افراد بھی ہوتے تو غونیب کو فتح کرنا یقینی طور پر مشکل ہوتا۔ لیکن صرف ۴۰۰ افراد کے ساتھ اس کے دفاع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دس کالموں میں سے ایک نہ ایک کالم کی فتح یقینی تھی اور اسے روکنے کے لیے جب دوسری طرف سے مدد بلائی جاتی تو وہ اطراف بالکل خالی رہ جاتیں۔

امام کرادریا کے سامنے والے پہاڑ پر اپنے خیمے میں موجود تھے اور دفاعی تیاریوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ انھوں نے یقیناً بیریاٹنکی کی آمد پر روسی کیمپ میں خوشی کے نعرے سُنے ہوں گے۔ تیس سال پہلے انھوں نے اسلام کی سربلندی کے لیے اس علاقے میں کام شروع کیا تھا۔ روسیوں کا سر کچلنے کے لیے وہ ایک طویل عرصے تک جدو جہد کرتے رہے تھے۔ انھیں اپنے مقاصد میں ایک بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی تھی لیکن اب انجام ان کے سامنے تھا۔ انھیں شہادت کی منزل قریب نظر آ رہی تھی۔ لیکن انھوں نے آخر دم تک دفاع کی ٹھان رکھی تھی۔ انھوں نے شروع سے لے کر آج کے دن تک اس عظیم مقصد کے لیے زندگی کا ایک ایک لمحہ وقف کر رکھا تھا۔ انھیں شدید ناکامیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا اور کامیابیوں نے بھی ان کے قدم چومے تھے۔ انھوں نے روسیوں کو عبرتناک شکستیں بھی دی تھیں اور خود بھی کئی بار شکست کا سامنا کیا تھا۔ پہلے امام کی زندگی میں انھوں نے پوری تندہی اور جانفشانی سے کام کیا تھا اور یہ معجزہ ہی تھا کہ وہ بچ نکلے تھے اور امام کے ساتھ شہید نہیں ہوئے۔ وہ ہمزاد کے دور میں بھی اسی طرح وفادار رہے اور اگر وہ چاہتے تو خود امامت سنبھال سکتے تھے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ ۱۸۳۴ء سے اب تک انھوں نے خود مریدین کی قیادت کی تھی اور پورے داغستان پر حکومت کرتے رہے تھے۔ اب جب کہ عمر بھر کی جدو جہد اور سالہا سال کی ان تھک کوششوں کے بعد ان کا سامنا روس کی لاتعداد افواج سے ہو رہا تھا اور انھیں شکست یقینی نظر آ رہی تھی، ان کا ضمیر مطمئن تھا کہ انھوں نے اپنے مقصد کی راہ میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی۔ ان کے ضمیر کی اس گواہی پر ہر غیر جانب دار مؤرخ ان کا ساتھ دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تحریک کی ناکامی ان کی کسی ذاتی کوتاہی کا نتیجہ نہیں تھی۔ حالات ہی ایسا رُخ اختیار کر چکے تھے کہ ان کا کوئی مداوا نہیں ہو سکتا تھا۔

## امامؒ کی عزیمت:

امامؒ بظاہر ناکام ہوئے لیکن ان کی ظاہری ناکامی پر ہزاروں کامیابیاں نچھاور کی جاسکتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان کی مخالف قوتوں کا اندازہ لگایا جائے تو اتنے طویل عرصے تک ان کا تحریک کو لے چلنا ہی خاصی حیرت انگیز بات لگتی ہے۔ ان کے مقابلے میں خارجی عوامل ہی نہیں تھے، داخلی صورت حال بھی ان کے مزاحم تھی۔ انھیں روس کی طاقت ہی کا سامنا نہیں تھا جس کے پاس بے شمار وسائل اور بے شمار فوجیں تھیں بلکہ انھیں اندرونی کش مکش اور قبائل کی آویزشوں سے بھی نمٹنا تھا اور حالات ایسے تھے کہ وہ نہ ایک طاقت پر قابو پا سکتے تھے اور نہ دوسرے کا سر کچل سکتے تھے۔ اگر پورے قفقاز میں ایک ہی قبیلہ یا ایک ہی نسل اور زبان کے لوگ آباد ہوتے تو شاید ان کا کام خاصا آسان ہو جاتا لیکن یہ لوگ ایک ہی کلمے کو ماننے کے باوجود ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ صدیوں کی دشمنیاں چشم زدن میں دور کر دینا خاصا مشکل کام تھا۔ اگر یہ قبائل متحد ہوتے تو امامؒ روس سے بھی بڑی طاقت سے ٹکر لے سکتے تھے۔ لیکن یہ اتحاد صرف اس وقت تک قائم رہا جب تک امامؒ پوری قوت سے روسیوں کے خلاف جہاد میں مشغول رہے۔ اس وقت تک انھیں آپس کے جھگڑوں اور نزاعات کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ لیکن جونہی جہاد کا زور وشور دھیما ہوا، انتشار کی قوتیں بروئے کار آگئیں۔ اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ امامؒ نے قبائل میں کافی حد تک تنظیم اور قانون کی پابندی کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اسے حالات کی ستم ظریفی کہیے کہ مریدیت کی تحریک کی وجہ سے قبائل میں اطاعت اور احکام کی پابندی کی جو عادت پیدا ہوئی تھی وہ بالآخر مریدیت کے کام آنے کی بجائے ان کے مخالفین کے کام آئی۔ امامؒ نے بعد میں ایک موقع پر کہا تھا کہ مجھے جس مقصد کے حصول کے لیے ایک طویل جدوجہد کرنا پڑی تھی، روسیوں نے اسے انتہائی اطمینان کے ساتھ حاصل کر لیا۔

امامؒ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ شریعت کے احکامات کے نفاذ کے بغیر قبائل میں اتحاد کسی صورت پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھیں سختی سے بھی کام لینا پڑا۔ انھوں نے

تبلیغ بھی کی۔ قبائل کو ساتھ ملانے کے لیے انھیں کئی بار قوت کا استعمال بھی کرنا پڑا۔ انھیں اس مقصد میں خاصی کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں لیکن ان کی کامیابیوں کے زمانۂ عروج میں اندر ہی اندر انتشار کی قوتیں بھی منظم ہو رہی تھیں۔ بظاہر اگرچہ کسی قسم کا انتشار محسوس نہیں ہوتا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ فتح اور کامرانی ہی کا دور دورہ ہے لیکن نفاق اندر ہی اندر گھُن کی طرح کھائے چلا جا رہا تھا۔ وہ لوگ جو اپنے قبیلے کے رسوم و رواج ہی پر ساری عمر چلتے رہے تھے، انھیں شریعت کے احکامات کی پابندی ایک بوجھ محسوس ہوتا تھا۔ امامؒ کے نائبین کی طرف سے کی جانے والی سختیاں بھی انھیں ناگوار گزرتی تھیں۔ پھر جنگ اس درجہ طویل ہو چکی تھی کہ لوگ تنگ آ چکے تھے۔ شاید ہی کوئی گاؤں بلکہ شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جہاں خاوند، باپ اور بھائی شہید نہ ہو چکے ہوں۔ خاندانوں کے خاندان ختم ہو چکے تھے۔ پوری کی پوری بستیاں برباد کی جا چکی تھیں۔ کھیتوں میں مدتوں سے ہل نہیں چلا تھا۔ پھلدار درختوں کی طرف کسی نے کوئی توجہ نہیں کی تھی۔

یہ سب کچھ داغستان میں ہُوا تھا جو امامؒ کا اپنا گھر تھا۔ جہاں امامؒ کا حکم بلا چون و چرا چلتا تھا۔ چیچنیا کا حال اس سے بھی بُرا تھا۔ ان لوگوں کو کبھی دوستوں اور کبھی دشمنوں کے ہاتھوں بار بار ہجرت کرنی پڑتی تھی۔ دوسری طرف روس اپنے بے پناہ وسائل کی وجہ سے ان غریب دہقانوں میں بے شمار دولت لٹا رہا تھا۔ اسے یہاں سے سکاوٹ، رہنمائی کرنے والے افراد، رسالہ جاسوس اور غداروں کی فوج چاہیے تھی۔ ایک طرف بے پناہ غُربت تھی جب کہ دوسری طرف بے شمار دولت۔ اس ساری صورت حال کو دیکھ کر ہمیں امامؒ کی ناکامی پر زیادہ تعجب نہیں ہوتا۔ تیس سال کی جنگوں نے لوگوں کے حوصلے پست کر دیے تھے۔ یہ ایسا بوجھ تھا جسے وہ اٹھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ اس ساری صورت حال کو دیکھتے ہوئے ہمیں ان کا روسیوں کے سامنے سر جھکا دینا زیادہ حیرت انگیز نظر آتا۔

روسیوں کا حملہ:

۲۵ اگست ۱۸۵۹ء کی کُہر آلود صبح کو عام حملہ شروع ہو گیا۔ مقامی گائیڈ حملے کی سمت متعین کر رہے تھے اور ہر جانب سے بٹالینوں نے دھاوا بول دیا تھا۔ امامؒ نے دیہات میں پسپائی اختیار کی۔ ایک جگہ ۱۰۰ کے قریب مرید آخر وقت تک لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ ایک جگہ کچھ اور

مریدین نے پوری رجمنٹ کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ بھی ایک ایک کر کے شہید ہو گئے۔ ان کے ساتھ تین عورتوں نے بھی انتہائی دلیری سے مقابلہ کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ بیریاٹنکی چاہتا تھا کہ امامؒ کو زندہ گرفتار کیا جائے۔ اسی لیے اس نے دیہات پر حملے سے پہلے ہتھیار رکھوانے کی ایک بار پھر کوشش کی۔ امامؒ تنہا ہوتے تو ممکن تھا وہ اسی طرح شہید ہو جاتے جیسے قاضی ملا غمری کے مقام پر شہید ہو گئے تھے۔ لیکن یہاں ان کے ہمراہ ان کے بیوی بچوں کے علاوہ وہ وفادار دیہاتی اور ان کے خاندان کے افراد بھی تھے جنھوں نے امامؒ کو آخر دم تک بچانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اس وقت جب کہ امامؒ کے لیے پورا داغستان اور چیچنیا دشمن بن چکا تھا اور لوگ ان کی جان اور مال کے درپے تھے، اُن بہادر دہقانوں نے انھیں پناہ دی تھی۔ پھر یہی نہیں امامؒ کے ساتھ دفاعی انتظامات میں دن رات ایک کر دیا تھا۔ اگر عام حملہ ہو جاتا تو شاید ان میں سے ایک ایک شخص امامؒ کے ساتھ شہید ہو جاتا اور گاؤں کا ایک فرد بھی زندہ نہ بچتا۔ امامؒ کو اپنے ان وفادار ساتھیوں بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کا خیال آ گیا اور انھوں نے دو ساتھیوں کو شرائط طے کرنے کے لیے روسیوں کے پاس بھیجا۔

روسیوں نے غیر مشروط ہتھیار ڈالنے کا مُطالبہ کیا۔ لیکن امامؒ اس کو کسی طرح ماننے کو تیار نہیں تھے۔ بالآخر کرنل لازاروف جو امامؒ کو ذاتی طور پر جانتا تھا، خود گاؤں میں آیا اور یہ وعدہ کیا کہ نہ صرف ان کی جان بخشی ہو گی بلکہ ان کے تمام ساتھیوں کو بھی امان دے دی جائے گی۔ امامؒ گھوڑے پر سوار ہو کر آگے بڑھے لیکن کچھ ہی دُور گئے ہوں گے کہ روسیوں نے اپنے دشمن کو اس حالت میں دیکھ کر تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ امامؒ رک گئے۔ باگیں کھینچیں اور گاؤں کی طرف پلٹنے لگے لیکن کرنل لازاروف یہ دیکھتے ہی ان کی طرف لپکا اور کہا کہ ان تالیوں کا مقصد عزت افزائی ہے اور یہ آپ کے استقبال کے لیے بجائی جا رہی تھیں۔ کرنل انھیں منا کر پھر لے آیا۔ ان کے ہمراہ ۵۰ مرید تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں مریدین کے لشکروں میں سے اب صرف یہی رہ گئے تھے۔ جب وہ بیریاٹنکی کے پاس پہنچے تو ان کی اور ان کے خاندان اور ساتھیوں کی حفاظت کا یقین دلایا گیا۔ امامؒ کا چہرہ تنا ہوا تھا اور ان کی عُقابی آنکھوں میں چمک تھی۔ دوسرے دن وہ شورا بھجوا دیے گئے جہاں سے انھیں رُوس بھیج دیا گیا۔ بعد میں ان کا خاندان بھی ان کے پاس پہنچا دیا

گیا۔ اس جنگ میں رُوسیوں کے ۱۸۰ سپاہی ہلاک اور زخمی ہوئے جب کہ دوسری طرف ۴۰۰ مریدوں میں سے صرف ۵۰ باقی بچے تھے۔ امامؒ ۱۸۶۹ء تک کلوگا میں رہے اور بعد میں انھیں ان کی خواہش کے مطابق خیوا منتقل کر دیا گیا۔ یہاں سے انھیں حج پر جانے کی اجازت مل گئی۔ بالآخر ۴ فروری ۱۸۷۱ء کو مدینہ مُنورہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

بنا کردند و خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

# ہماری دیگر کتابیں

| | |
|---|---|
| سیرت رحمت عالمؐ | ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری، مترجم: خدا بخش کلیار |
| دروس سیرت | ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی۔ مترجم: ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی |
| عورت عہد رسالت میں | عبدالحلیم ابوشقہ۔ مترجم: محمد فہیم اختر ندوی |
| اُردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر | ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی |
| حیاتِ نذیرؒ | عبدالرشید عراقی |
| سائنس قرآن کے حضور میں | طارق اقبال سوہدروی |
| Life & learning | Umer Farooq Barlas |
| Sex & Sexuality in Islam | Dr. Aftab Ahmad |
| علوم الحدیث، فنی، فکری اور تاریخی مطالعہ | ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر |
| سیرت رسولؐ قرآن کے آئینے میں | ڈاکٹر عبدالغفور راشد |
| دنیائے اسلام میں سائنس وطب کا عروج | ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی |
| قائداعظم، مسلم لیگ اور تحریک پاکستان | محمد حنیف شاہد |
| استحکام پاکستان | کے ایم اعظم |
| تاج محل کے دیس میں | حکیم راحت نسیم سوہدروی |
| دنیا اور مغرب | پروفیسر ٹائن بی |
| آب زم زم، غذا، دوا اور شفا | ڈاکٹر خالد جاد |
| میاں عبدالعزیز مالواڈہ | محمد اسحاق بھٹی |
| امتحان میں کامیابی کے زرّیں اُصول | خواجہ ولید سالک |

عالم اسلام کے عظیم مجاہد
امام شامل رح
لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
ڈاکٹر محمد حامد
نشریات